﴿بعض دیگر لوگوں کی تاویل اور اس کا بطلان﴾

بعض لوگ اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو "تأويل القول بما لا يرضى به قائله" کے قبیل سے معلوم ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل میں بیع ڈالر میں ہوتی ہے جس کی قیمت کی کمی بیشی کا اثر پاکستانی کرنسی پر پڑنا لازم ہے، اور یہ کوئی اچنبے کی بات نہیں۔

اُقول! یہ تاویل دو وجہوں سے درست نہیں۔

(۱) حضرت مدظلہ نے خود تحریر فرمایا ہے کہ اضافہ پندرہ فی صد تک ہوگا (کما مر آنفا)......اگر ڈالر پر معاملہ ہوتا تو اس میں دس یا پندرہ فی صد وغیرہ کا اعتبار نہ ہوتا۔

(۲) ڈالر کی قیمت گر جانے کی صورت میں اس کے مطابق پاکستانی روپے کم لئے جانے چاہئیں۔ جبکہ اس کی طرف حضرت کی تحریر میں اشارۃً بھی ذکر نہیں اور نہ ہی آج تک سنا گیا ہے کہ بینکوں نے ڈالر کی قیمت میں کمی کی صورت میں اس کے مطابق کسی سے پاکستانی روپے کم وصول کیے ہوں۔

(۱۱) ﴿بوقتِ مرابحہ واجارہ ''لزومِ التزامِ تصدقِ مال''﴾

اس سے متعلق تین باتیں پیش خدمت ہیں۔

(۱) اصل مسئلہ

(۲) بعض حضرات مالکیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول اور اس کا مصداق اور مفصل جوابات

(۳) لزومِ التزامِ تصدقِ مال کا حکم

(۱) اصل مسئلہ

یعنی مرابحہ اور اجارہ کے وقت دائن کے حق کو تحفظ دینے کی شرعی تدبیر کیا ہے؟

مرابحہ اور اجارہ کے وقت دائن کے حق کو بروقت ادا کرنے کے لئے شرعی تدبیر دو چیزیں ہیں۔(۱) کتابت وشہادت (۲) رہن۔

اس کے علاوہ تیسری چیز کا ذکر کہیں بھی نہیں لہٰذا دائن کے حق کے تحفظ کی خاطر ''لزومِ التزامِ تصدقِ مال'' کا قول کرنا کتاب اللہ تعالیٰ، سنت رسول اللہ ﷺ اور مذاہب اربعہ کے خلاف ہے۔

دیکھئے نزولِ وحی کے وقت بھی "مطل غنی" (غنی کا ٹال مٹول کرنا اور وقت پر قرض ادا نہ کرنا) کی صورتیں موجود تھیں پھر بھی قرآن کریم نے دائن ومقرض کے حق کو تحفظ دینے کے لئے دو چیزوں کو ہی کافی سمجھا ہے، ایک کتابت وشہادت اور دوسری رہن۔ فرمایا ﴿ **اذا تداينتم بدين الى أجل مسمى فاكتبوه، الآية** ﴾ ﴿ **و ان كنتم على سفر و لم تجدوا كاتبا فرهٰن مقبوضة، الآية** ﴾

آپ ﷺ نے بھی کتاب اللہ تعالیٰ ہی کے ضابطہ کو برقرار رکھ کر " **مطل الغنى ظلم** " باوجود غنا و استطاعت کے غنی کا قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول ظلم ہے، جیسی وعیدوں کے ذریعے مماطل کو ڈرایا ہے تاکہ دائن ومقرض کا حق بروقت ادا ہو، التزامِ تصدق کا حکم نہیں دیا۔

کتاب اللہ تعالیٰ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں ان کے علاوہ کہیں بھی اس تیسری چیز کا ذکر نہیں کہ مرابحہ واجارہ کی صورت میں ''لزومِ التزامِ تصدقِ مال'' کے ذریعے بھی تحفظ دیا جاسکتا ہے۔ مذاہب اربعہ میں بھی کتاب اللہ تعالیٰ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہی کے اس ضابطہ کو برقرار رکھا گیا ہے، جس کی تفصیلات کتبِ فقہیہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان مذاہب میں بھی کسی کے ذہن میں دائن کے حق کو تحفظ دینے کی یہ تیسری صورت یعنی ''لزومِ التزامِ تصدقِ مال''، نہیں آئی ورنہ ضرور لکھتے۔

البتہ مدعا علیہ، مستقرض اور مستاجر اپنے اوپر مدعی، مقرِض اور موجر کا اعتماد اور بھروسہ پیدا

کرنے اور قائم رکھنے کے لئے درج ذیل صورتیں بھی اختیار کرسکتا ہے:

(۱) قسم کھانا، کوئی کہے کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تیرا حق فلاں تاریخ تک ضرور ادا کروں گا۔

(۲) تعلیقاً طلاق دینا، مثلاً یوں کہے اگر تیرا حق فلاں تاریخ تک ادا نہ کیا تو میری بیوی کو طلاق۔

(۳) نذر ماننا، مثلاً یوں کہے کہ اگر تیرا حق فلاں وقت تک ادا نہ کیا تو میرے ذمے اتنا صدقہ ہے۔ جیسے مالکیہ کے مذہب میں ہے۔

(۴) کفیل اور ضامن دینا، مثلاً کسی کو بطور کفیل اور ضامن پیش کرے کہ اگر مجھ پر اعتماد نہیں تو یہ میرا کفیل اور ضامن ہے، اگر فلاں تاریخ تک میں نے ادائیگی نہیں کی تو آپ اس سے وصول کرلیں۔

تنبیہ: اجارہ میں رہن کی صورت بنا بر تسلیم صحتِ رہن فی الامانات ہے۔ (ورنہ اصل مسئلہ عدمِ جوازِ رہن فی الامانات کا ہے، جس کی تفصیل ماسبق میں ''سیکوریٹی ڈیپازٹ'' کے عنوان کے تحت گزر چکی ہے)

(۲) ﴿بعض مالکیہ کا قول﴾

حضرات مالکیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی جس عبارت سے استدلال کرتے ہوئے مجوزین حضرات نے ''لزومِ التزامِ تصدقِ مال'' کا قول فرمایا ہے، اس عبارت میں مرابحہ، اجارہ وغیرہما عقود کے وقت دائن ومقرض کے دین وقرض کی بروقت ادائیگی کے لئے مدیون ومقروض پر التزامِ تصدقِ مال کو لازم کرنے کا مطلقاً ذکر ہی نہیں، نہ صراحۃً اور نہ اشارۃً، اس عبارت میں تو صرف اس کا بیان ہے کہ گر کوئی طیبِ خاطر سے کسی کا حق ادا کرنے کے لئے اپنے اوپر بذریعہ نذر

۲

کسی چیز کو لازم کردے تو اس کا پورا کرنا دیانۃً تو واجب ہے، قضاءً واجب ہے یا نہیں؟ بعض کے نزدیک قضاءً بھی واجب ہے۔

پوری عبارت ملاحظہ فرمائیں:

و قد تكلم الخطاب رحمه الله على هذه المسألة ببسط في كتابه "تحرير الكلام في مسائل الالتزام" و قال فيه :

(أما اذا التزم المدعا عليه للمدعي أنه ان لم يؤفه حقه في وقت كذا فله عليه كذا و كذا، فهذا لا يختلف في بطلانه، لأنه صريح الربا، و سواء كان الشيء الملتزم به من جنس الدين أو غيره، و سواء كان شيئا معينا أو منفعة ......

و أما اذا التزم أنه ان لم يؤف حقه في وقت كذا ، فعليه كذا و كذا لفلان ، أو صدقة للمساكين ، فهذا هو محل الخلاف المعقود له هذا الباب ، فالمشهور أنه لا يقضى به كما تقدم ، و قال ابن دينار: يقضى به)

و قال قبل ذلك:(و حكاية الباجي الاتفاق على عدم اللزوم فيما اذا كان على وجه اليمين غير مسلمة، لوجود الخلاف في ذلك كما تقدم، و كما سيأتي)

و ان الخطاب رحمه الله و ان رجح عدم اللزوم، و لكنه قال في آخر الباب : (اذا قلنا: ان الالتزام المعلق على فعل الملتزم الذي على وجه اليمين لا يقضى به على المشهور، فاعلم أن هذا ما لم يحكم بصحة الالتزام المذكور حاكم، و أما اذا حكم حاكم بصحته أو بلزومه، فقد تعين الحكم به، لأن الحاكم اذا حكم بقول لزم العمل

۳ ا

به و ارتفع الخلاف)(بحوث فی قضایا فقهية معاصرة ص۳۵، ۳۶)

[illegible]

۴

کہ ملتزم جب اپنے کسی فعل پر علی وجه الیمین التزام کرلے تو قضاءً وہ

[illegible]

ا

۵

حجر؟ فقلت : نعم اتباع الهوى حرام ، و المرجوح في مقابلة

۶

(الف) مالکیہ کے نزدیک اس میں مقترض کی جانب سے لزومِ التزام کا کوئی ذکر نہیں ہے

۷

میسرۃ ﴾ جبکہ لزومِ التزام کا فارم سب کو بھرنا ہے۔ اگرچہ حضرت مفتی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: ''جب غیر سودی بینکوں میں اس تجویز پر عمل کیا گیا تو اس میں دو شرطیں عائد کی گئیں۔ ایک یہ کہ اگر ادائیگی میں تأخیر گاہک کے اعسار یعنی تنگدستی کی وجہ سے ہو رہی ہے تو وہ صورت اس التزام میں شامل نہ ہوگی'' (غیر سودی بینکاری ۲۸۰)

لیکن عرض یہ ہے کہ اس تحقیق کے لئے بینک نے کونسی کمیٹی بنائی ہے اور اس عذر کے بیان کا آج تک کس کو موقع دیا گیا ہے؟

(۵) اس عبارت میں عقدِ مرابحہ واجارہ کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ معاملہ کے بعد مدعی کے حق کو بروقت ادا کرنے کے لئے مدعی کے اصرار اور دباؤ کے بغیر مدعا علیہ کی جانب سے ''التزامِ تصدقِ مال'' کا بیان ہے، جس کو شریعت میں نذر کہا جاتا ہے اور یہ بالاتفاق دیانۃً واجب ہے اور بعض مالکی فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک حکمِ قاضی سے قضاءً بھی واجب ہو جاتا ہے، ''لزومِ التزامِ تصدقِ مال'' کا بیان نہیں۔

لہٰذا کتاب اللہ تعالیٰ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں دائن کے حق کے تحفظ کے لئے جن دو چیزوں کا ذکر ہے، اس عبارت میں کتاب اللہ تعالیٰ و سنت رسول اللہ ﷺ کے خلاف کرتے ہوئے کسی تیسری چیز یعنی ''لزومِ التزامِ تصدقِ مال'' کا ذکر نہیں۔ اس تفصیل کے پیش نظر یہی کہا جائے گا کہ یہ تیسری چیز مجوزین حضرات کی ایجاد ہے، مذہبِ مالکیہ مکمل طور پر اس سے بری ہے۔

(۶) مالکیہ کے اس مسئلہ میں ہمارے زیرِ بحث مسئلے کا حکم نہیں، کیونکہ زیرِ بحث مسئلے میں انعقاد و ایجادِ معاملہ کے وقت التزام ہوتا ہے جبکہ مالکیہ کے مسئلہ میں کسی معاملہ کے بعد مدعا علیہ اعتماد دلانے کے لئے مدعی کے سابق حق کو بروقت ادا کرنے کے لئے التزام کرتا ہے۔

(۷) بینکوں میں التزام کے حوالے سے غیر مسلم و حرام آمدنی والے کی نذر اور مصارف

۸

کے بارے میں تفصیلات میسر نہ آسکیں ورنہ اس پر شرعی نقطۂ نظر سے تبصرہ ہوتا۔ کیونکہ حرام آمدنی والے کا ثواب کی نیت سے صدقہ کرنا کفر ہے۔ نیز وہ نذر جو ثواب اور قربۃ کی نیت سے ہو کافر اس کا اہل ہی نہیں۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : و اعلم أن اشتراط الاسلام انما يناسب اليمين بالله تعالىٰ و اليمين بالقرب نحو ان فعلت كذا فعلي صلوة و أما اليمين بغير القرب نحو ان فعلت كذا فأنت طالق فلا يشترط له الاسلام كما لا يخفى اهـ (الشامية ۵ / ۴۹۰ ، رشيدية) و قال أيضاً رحمه الله تعالىٰ : رجل دفع الى فقير من المال الحرام شيئا يرجو به الثواب يكفر ، و لو علم الفقير بذلک فدعا له و أمن المعطى كفرا جميعاً

(الشامية ۳/۲۹۱ ، رشيدية)

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جان لینا چاہئے کہ اسلام کی شرط صرف دو صورتوں میں مناسب ہے ایک اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھانے کی صورت میں اور دوسری کسی باعثِ قربت چیز کے ساتھ قسم کھانے کی صورت میں جیسا کہ یوں کہے ''اگر میں نے فلاں کام کیا تو میرے اوپر نماز لازم ہے'' اور باعثِ قربت چیز کے علاوہ کسی اور چیز کی قسم کھانے کی صورت میں اسلام کی شرط نہیں ہے جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا ہے جیسا کہ کوئی آدمی اپنی بیوی کو مخاطب کر کے کہے ''اگر میں نے فلاں کام کیا تو تجھے طلاق ہے''۔

اسی طرح علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''کسی آدمی نے فقیر کو بنیت

٩

ثواب مالِ حرام میں سے کچھ دیا تو کافر ہو جائے گا اور اگر فقیر کو بھی اس کا علم ہو اور اس کے باوجود فقیر نے دینے والے کے لئے دعا کی اور اس نے اس پر امین کہا تو دونوں کافر ہو جائیں گے‘‘۔

قال فی الھندیة : و لو کان أحد الشرکاء ذمیا کتابیا أو غیر کتابی و ھو یرید اللحم أو یرید القربة فی دینه لم یجزئھم عندنا لأن الکافر لا یتحقق منه القربة فکانت نیته ملحقة بالعدم فکان یرید اللحم و المسلم لو أراد اللحم لا یجوز عندنا و کذلک اذا کان أحدھم عبدا أو مدبرا و یرید أضحیة کذا فی البدائع

(الھندیة ٣٠٤/٥)

اور ہندیہ میں ہے’’اگر (قربانی کے) شرکاء میں سے کوئی ایک ذمی ہو یا کتابی نہ ہو لیکن اس کا مقصد صرف گوشت حاصل کرنا ہو یا وہ اپنے دین میں ثواب کا ارادہ رکھتا ہو تو ہمارے ہاں ان شرکاء میں سے کسی کی بھی قربانی نہیں ہوگی، اگر کافر ہے تو اس لئے کہ کافر سے ثواب کی نیت درست نہیں ہے لہٰذا اس کی نیت کالعدم ہے تو گویا کہ وہ صرف گوشت کا ارادہ رکھتا ہے اور اگر مسلمان ہے تو اس لئے کہ مسلمان (قربانی میں) اگر صرف گوشت کا ارادہ رکھتا ہو تو ہمارے ہاں اس کی قربانی درست نہیں ہے اور اگر شرکاء میں سے کوئی ایک غلام ہو یا مدبر ہو اور قربانی کرنا چاہتا ہو تو بھی یہی حکم ہے۔

(٣) ’’لزومِ التزامِ تصدقِ مال‘‘ کا حکم

تحریر فرماتے ہیں:

ہے

١٠

تحت لازم ، لیکن اگر بالفرض وہ اس قاعدے میں داخل نہ بھی ہو تو صاحبِ اشباہ کے قول کے مطابق محلِ نظر قرار پا کر مسکوت عنہ ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر کسی اور مذہب سے کوئی قول لے لیا جائے تو اس کو خروج عن المذہب نہیں کہا جائے گا۔‘‘ (غیر سودی بینکاری ٢٨٣)

اَقول: اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مدظلہ کے نزدیک التزامِ تصدق کے وعدہ کے وجوب کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔

(١) نذر

(٢) غیر نذر جس کا وجوب مالکی مذہب سے لیا گیا ہے۔

پہلی وجہ: یعنی نذر سے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ بات مسلم ہے کہ نذر کوئی خوشی سے مانے یا ناخوشی سے ہر صورت میں لازم اور واجب ہے، اگرچہ ناخوشی کی صورت میں مکرِہ اور زبردستی کرنے والا کسی درجہ میں گناہ گار ضرور ہوگا، یہاں تک تو اتفاق ہے، لیکن نذر کا حکم جو صراحۃً حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے، بینک میں اس کے خلاف ہو رہا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ نذر کی دو قسمیں ہیں:

(١) نذرِ مطلق

(٢) نذرِ معلق، پھر نذرِ معلق کی دو صورتیں ہیں:’’ نذر معلق بشرط یُرَادُ کَوْنُه ‘‘ اور’’ نذر معلق بشرط لایُرَادُ کَوْنُه ‘‘۔

نذرِ مطلق: اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص بغیر کسی شرط اور تعلیق کے کوئی چیز اپنے اوپر لازم کر لے۔

نذرِ معلق: اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی شرط اور تعلیق کے ساتھ اپنے اوپر کوئی

چیز لازم کرلے۔ پھراس کی دو صورتیں ہیں اور ہر ایک کا حکم الگ ہے۔

'' **نذر معلق بشرط یُرَادُ کَوْنُہ** '': یہ ہے جس میں نذر ماننے والا شرط کے وقوع اور ہونے کا ارادہ رکھتا ہے یعنی وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرط اور تعلیق کے مطابق معاملہ فرمائیں مثلاً اگر میرے مریض کو شفا ہوئی تو اتنا صدقہ کروں گا، یا میرا فلاں گمشدہ بھائی لوٹ آیا تو اس قدر صدقہ کرونگا۔

حکم: **نذرِ مطلق اور نذرِ معلق بشرط یراد کونہ** دونوں کا حکم ایک ہے کہ نذر ماننے والے کے ذمہ منذور شی ء یا اس کی قیمت دیانۃً واجب ہے یعنی وجوب اور لزوم بین اللہ وبین العبد ہوتا ہے، اور عدمِ ادا کی صورت میں اس کا مواخذہ صرف آخرت میں ہوسکتا ہے، دنیا میں کسی کو اس کے مواخذہ کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس حکم کا حاصل یہ ہے کہ وجوب کے بعد یہ شخص ادا میں آزاد ہے جب چاہے ادا کرے۔

'' **نذر معلق بشرط لا یُرَادُ کَوْنُہ** '': اس کا مطلب یہ ہے کہ نذر ماننے والا شرط کے وقوع اور ہونے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ ناپسندیدہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو روکنے کے لئے نذر مانتا ہے یعنی جس چیز کو وہ بطور شرط کے ذکر کرتا ہے اس کے ہونے کو نہیں چاہتا بلکہ نہ ہونے کو چاہتا ہے مثلاً کوئی یوں کہے کہ اگر میں نے زنا کیا تو اتنے روزے رکھوں گا یا اتنا روپیہ صدقہ کروں گا۔

حکم: راجح قول کے مطابق اس صورت میں نذر ماننے والے کو نذر اور کفارۂ یمین میں اختیار ہے، یعنی چاہے تو اپنی نذر پوری کرے یا قسم کا کفارہ ادا کرے۔

نذر کی اس تفصیل کے بعد بینک کے اس نظام پر غور کیا جائے کہ یہ نذر کی کس قسم میں داخل ہے۔ غور کرنے سے بآسانی یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ بینک کا یہ لزومِ التزام'' **نذر معلق**

ہے

۱۲

سے یہ التزام کرواتا ، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایسی شرطیں ہیں جن کے وقوع اور ہونے کو ملتزِم نہیں چاہتا۔ لہٰذا شرعاً مشتری اور مستاجر (کلائنٹ) کے ذمے بعینہ یہ نذر پوری کرنا ضروری نہیں، بلکہ اس کو اختیار ہے کہ بجائے ادائے نذر قسم کا کفارہ دے کر بری الذمہ ہوجائے۔ جبکہ بینک اس کو نذر ہی پر مجبور کرتا ہے اور بینک کا یہ مجبور کرنا خلاف شرع اور ناجائز ہے۔

نیز اگر کوئی اس **نذرِ معلق بشر یراد کونہ** میں داخل کرنے پر بضد ہے تو بنا برتسلیم عرض یہ ہے کہ بینک میں نذر کی اس قسم کے حکم کی بھی مخالفت ہورہی ہے کیونکہ اس قسم میں مطالبہ صرف دیانۃً ہے مخلوق میں سے کسی کو جائز نہیں کہ اس سے ادا کا مطالبہ کرے، نیز اس میں فقیر، مکان اور وقت کی تعیین اگرچہ ناذر کر بھی لے تو بھی اس کی پابندی شرعاً اس کے ذمے لازم نہیں، بلکہ شریعت نے ان سب امور میں اس کو آزادی اور اختیار دیا ہے، جبکہ بینک نے اس کی اس آزادی کو سلب کیا ہے۔ بینک کے پاس جمع نہ کرنے کی صورت میں بینک اس کا مواخذہ کرتا ہے، اور اس کے صوابدید کے بجائے بینک اپنے صوابدید پر خرچ کرتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں شرعاً درست نہیں، ان کے ثبوت اور جواز کے لئے حوالہ درکار ہے۔

قال الامام المرغینانی رحمہ اللہ تعالیٰ: (و من نذر نذرا مطلقا فعلیہ الوفاء) لقولہ ﷺ: من نذر و سمی فعلیہ الوفاء بما سمی.

(الھدایۃ ۲/۴۸۰ ط: رحمانیہ)

قال فی التنویر و شرحہ: ثم ان المعلق فیہ تفصیل فان (علقہ بشرط یریدہ کأن قدم غائبی) أو شفی مریضی (یوفی) وجوبا (ان وجد الشرط (و) ان علقہ (بما لم یردہ کان زنیت بفلانۃ) مثلا فحنث (وفی) بنذرہ (أو کفر) یمینہ (علی المذھب) لأنہ نذر بظاھرہ، یمین بمعناہ فیتخیر ضرورۃ.

۳

و قال العلامة الشامی رحمه الله تعالیٰ :(قوله : ثم ان المعلق الخ) : اعلـم أن المذكور فی كتب ظاهر الرواية أن المعلق يجب الوفاء به مطلقا: أی سواء كان الشرط مما يراد كونه: ای يطلب حصوله كإن شفی الله مريضی أو لا كإن كلمت زيدا أو دخلت الدار فكذا وهو المسمی عند الشافعية نذر اللجاج وروی عن أبی حنيفة التفصيل المذكور هنا وأنه راجع إليه قبل موته بسبعة أيام وفی الهداية: إنه قول محمد وهو الصحيح اه ومشی عليه أصحاب المتون كالمختار والمجمع ومختصر النقاية والملتقی وغيرها وهو مذهب الشافعی وذكر فی الفتح أنه المروی فی النوادر وأنه مختار المحققين.

(الشامية ۵ / ۵۴۲ ط : رشيديه)

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالیٰ : (لزم النذر) أی لزمه الوفاء به و المراد أنه يلزمه الوفاء بأصل القربة التی التزمها لا بكل وصف التزمه لأنه لو عين درهما أو فقيرا أو مكانا للتصدق أو للصلوة فالتعيين ليس بلازم ، بحر ، و تحقيقه فی الفتح .

(الشامية ۵ /۵۳۸)

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ(نذر لازم ہے)یعنی اس کو پورا کرنا لازم ہےاور مراد یہ ہے کہ اس کے ذمہ اس اصل نیکی (عبادت) کا پورا کرنا لازم ہے جس کو اس نے اپنے اوپر لازم کیا ہے نہ کہ ہر اس وصف کے ساتھ جس کا اس نے التزام کیا اس لئے کہ اگر اس نے صدقہ کرنے کے لئے کسی درہم یا کسی فقیر یا پھر کسی جگہ کو صدقہ کرنے یا نماز پڑھنے کے

ہے

القدیر میں ۔

قال الامام المرغينانی رحمه الله تعالیٰ : و النذر لا يعمل فيه الاكراه لأنه لا يحتمل الفسخ و لا رجوع للمكره بما لزمه لأنه لا مطالب له فی الدنيا فلا يطالب به فيها الخ

علامہ مرغینانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نذر میں اکراہ جاری نہیں ہوتا اس لئے کہ نظر فسخ کا احتمال نہیں رکھتی اور مکرہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ جو چیز اس پر لازم ہوئی اس کا مکرہ مطالبہ کرے اس لئے کہ دنیا میں اس کا (نذر کا) کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں ہے لہٰذا دنیا میں اس کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

قال العلامة الخوارزمی رحمه الله تعالیٰ : (قوله : و النذر لا يعمل فيه الاكراه) حتی لو أكره بوعيد تلف علی أن يوجب علی نفسه صدقة أو صوما أو حجا ماشيا يتقرب به الی الله تعالیٰ ففعل لزمه ذلك و كذا ان أكرهه علی اليمين بشیء من ذلك أو بغيره لأن النذر مما لا يلحقه الفسخ لأنه يمين لقوله عليه السلام ((النذر يمين)) و هی مما لا يحتمل الفسخ و ما لا يؤثر فيه الفسخ بعد وقوعه لا يؤثر فيه الاكراه من حيث الصحة كالعتاق و هذا لأن أثر الاكراه فی فوات الرضا و أثره فی عدم اللزوم و أثره فی حق الفسخ فما لا يحتمل الفسخ لا يتأتی فيه أثر الاكراه فلا يؤثر فيه الاكراه ، (قوله : لأنه لا مطالب له فی الدنيا فلا يطالب به فيها) و ذلك لأنه أوجب عليه حكما يطالب به فی الآخرة و لا يظهر أثره فی الدنيا من حيث الالزام

۵

زائدا علی ما أوجبه و هذا لا يجوز. (الكفاية على هامش الفتح ٨/ ١٨١، ١٨٢، و راجع له أيضا "مبسوط السرخسي" ٢٣/ ١٢٢)

علامہ خورازمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں صاحبِ ہدایہ کے اس قول کے بارے میں کہ (اور نذر میں اکراہ جاری نہیں ہوتا) یہاں تک کہ اگر کسی کو دھمکی دے کر مجبور کر دیا جائے کہ وہ اپنے اوپر کچھ صدقہ یا روزہ یا پیدل حج لازم کرے اور اس سے اللہ تعالیٰ کا تقرب مقصود ہو تو اس پر اب یہ نذر لازم ہے اور اگر کسی کو ان مذکورہ اشیاء یا کسی اور چیز کے بارے میں قسم پر مجبور کر دیا جائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اس لئے کہ نذر ان چیزوں میں سے ہے جو فسخ نہیں ہوسکتیں نبی کریم ﷺ کے اس قول ''نذر یمین ہے'' کے مطابق کہ نذر ایک قسم ہے اور یمین ان چیزوں میں سے ہے جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتی اور جو اشیاء ایک بار واقع ہو جانے کے بعد فسخ نہ ہوسکتیں تو ان میں صحت کے اعتبار سے اکراہ بھی مؤثر نہیں ہوتا، جیسا کہ ''کسی غلام کو آزاد کرنا'' اور یہ اس وجہ سے کہ اکراہ کا اثر رضامندی کے فوت ہونے میں ہے اور عدمِ رضا کا اثر لازم نہ ہونے میں ہے اور حقِ فسخ میں ہے تو جو اشیاء فسخ کا احتمال ہی نہیں رکھتیں، ان میں اکراہ کا اثر بھی جاری نہیں ہوگا اور ان میں اکراہ مؤثر نہیں ہوگا۔ صاحبِ ہدایہ کا یہ قول کہ (دنیا میں کوئی اس کا مطالب نہیں تو دنیا میں اس کا مطالبہ بھی نہیں ہوگا) یہ اس وجہ سے کہ نذر ماننے والے نے اپنے اوپر ایسے حکم کو واجب کیا ہے جس کا اس سے آخرت میں مطالبہ کیا جائیگا اور دنیا میں لازم کرنے کے اعتبار سے اسکا اثر ظاہر نہیں ہو سکتا، لہٰذا ہم اگر مکرہ پر ضمان کو لازم کر دیں تو حاکم اس سے ضمان لے گا اور

۱۶

اس کو قید بھی کرے گا۔ تو نذر ماننے والے نے جو اپنے اوپر لازم کیا ہے یہ اس سے زائد ہو جائے گا، جو کہ جائز نہیں۔

آخر میں فرماتے ہیں:

''رہی یہ بات کہ صدقہ اختیاری ہوتا ہے اور اسے لازم کر کے جبری بنا دیا گیا ہے، تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ ہر نذر کا یہی حال ہوتا ہے کہ اس سے اختیاری عبادت واجب اور لازم ہو جاتی ہے۔''

(غیر سودی بینکاری ۲۹۷)

أقول! ایک آدمی اپنے اختیار سے فقیر کے لئے نذر مانتا ہے کہ میرے ذمہ فلاں فقیر کو دس ہزار روپیہ کا صدقہ دینا لازم ہے اور دوسرا آدمی کسی بدمعاش کے ڈنڈے اور دھمکانے سے کسی فقیر کے لئے دس ہزار روپیہ صدقہ کی نذر مانتا ہے کیا ان دونوں میں فرق نہیں؟ پہلی قسم میں اختیاری صدقہ کو اپنے اختیار اور خوشی سے لازم کر رہا ہے اور دوسری صورت میں اختیاری صدقہ کو بدمعاش کے ڈر سے بدوں خوشی، رضائے تام کے لازم کرتا ہے ...... الحاصل ہر نذر میں اختیاری عبادت ناذر کی رضائے تام اور خوشی سے لازم ہوتی ہے اور بینک میں اختیاری عبادت رضائے تام اور دل کی خوشی سے نہیں بلکہ دباؤ سے لازم ہوتی ہے، اگرچہ دباؤ سے بھی شرعاً نذر لازم ہو جاتی ہے (کما مر في عبارة الكفاية) لیکن کیا یہ دباؤ ڈالنا اور اس کے ذمہ نذر لازم کرنا جائز ہے؟

دوسری وجہ: یعنی غیر نذر جس کا وجوب مالکی مذہب سے لیا گیا ہے، سے متعلق درج ذیل گذارشات ہیں۔

اولاً: یہ عرض ہے کہ یہ ان کے مذہب میں بھی نذر رہے، ان کے مذہب کی جو عبارت نقل

فرمائی گئی ہے اس کے بعض اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

و أما اذا التزم أنه ان لم يؤف حقه في وقت كذا، فعليه كذا و كذا لفلان، أو صدقة للمساكين، .... اذا قلنا: ان الالتزام المعلق على فعل الملتزم الذي على وجه اليمين لا يقضى به على المشهور،

دونوں عبارتوں میں تعلیق ہے، اور تعلیق نذر کی ایک صورت ہے۔ اور دوسری عبارت میں "على وجه اليمين" کی تصریح ہے اور یمین بالشیء نذر ہی ہے۔

كما صرح به في الكفاية : و كذا ان أكرهه على اليمين بشيء من ذلك أو بغيره لأن النذر مما لا يلحقه الفسخ لأنه يمين لقوله عليه السلام ((النذر يمين))

(الكفاية على هامش الفتح ۸ / ۱۸۱ ، ۱۸۲)

جب اس کا نذر ہونا مذہب مالکی میں ثابت ہوا تو اس پر نذر کے احکام جاری ہوں گے اور نذر کے احکام فقہ حنفی میں موجود ہیں، لہٰذا فقہ حنفی کو چھوڑ کر فقہ مالکی کی طرف جانا خروج عن المذہب نہیں تو اور کیا ہے؟

ثانیاً: اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ التزامِ تصدق کا وعدہ نذر نہیں اور مذہب مالکیہ میں بھی اس التزام کو نذر نہیں کہا گیا تو بھی یہ خروج عن المذہب ہے، کیونکہ بینک نے ''التزامِ تصدقِ مال'' کو مشتری اور مستاجر پر جبراً لازم کیا ہے کہ وقت پر عدمِ ادائیگی کی صورت میں چندہ فنڈ میں چندہ دینا ضروری ہے اگر چہ اس کی طیبِ خاطر اور رضائے تام نہ ہو، اور بدوں طیبِ خاطر اور رضائے تام کسی سے چندہ وصول کرنے کا حکم قرآن کریم واحادیث مبارکہ اور فقہ حنفی بلکہ دوسرے مذاہب میں بھی صراحۃً موجود ہے کہ اس طرح چندہ وصول کرنا حرام اور ناجائز

۱۸

ہے۔ حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی مالداروں سے بدوں طیبِ خاطر چندہ وصول کرنے کو ناجائز فرماتے ہیں:

''آج کل ایک عام دستور یہ ہوگیا ہے کہ اہلِ خیر کو کسی بہانے سے کہیں جمع کر کے ان سے رقم کا مطالبہ کیا جاتا ہے، یہ طریقہ انفرادی طور پر کسی سے سوال کرنے کی بنسبت بھی زیادہ قبیح ہے اس صورت میں مجمع میں رسوائی سے بچنے کے لئے بادلِ نخواستہ چندہ دینا پڑتا ہے جو بلاشبہ جبر ہے اس لئے یہ طریقہ بالکل ناجائز اور حرام ہے۔''

(رسالہ ''صیانۃ العلماء'' احسن الفتاوی ۱/ ۴۳۷)

قرآن کریم کی متعدد آیات میں کسی کا مال اس کی دلی رضا اور خوشی کے بغیر ناحق اور باطل طریقہ پر کھانے کی حرمت صراحۃً مذکور ہے۔

﴿ و لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل ﴾ (۱۸۸ : البقرة)

﴿يا أيها الذين أمنوا لا تأكلوا اموالكم بينكم بالباطل الا أن تكون تجارة عن تراض منكم﴾ (۲۹ : النساء)

اور حدیث میں صریح الفاظ میں ''ألا لا تظلموا، ألا لا يحل مال امرء الا بطيب نفس منه'' (المشكوة ص ۲۵۵) کہ طیب نفس یعنی دل کی خوشی کے بغیر کسی کا مال حلال نہیں۔

اور فقہ میں ایسی متعدد جزئیات ہیں جن میں حلت کا مدار طیب نفس اور دلی رضا کو بنایا ہے اور جہاں دلی خوشی نہیں ہوتی وہاں حرمت کا حکم لگایا گیا ہے۔ مثلاً عورت کے مہر کو اس کی اجازت سے والد کے لئے استعمال جائز ہے لیکن صرف زبانی اجازت نہیں بلکہ دل سے بھی راضی ہو۔

۹

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: قوله: (و صح حطها) الحط: الاسقاط كما في المغرب، و قيد بحطها ؛ لأن حط أبيها غير صحيح لو صغيرة، و لو كبيرة توقف على اجازتها، و لا بد من رضاها.

ففي هبة الخلاصة: خوفها الضرب حتى وهبت مهرها لم يصح لو قادرا على الضرب اهـ (رد المحتار ۴/۲۳۹)

یہاں پر ہبہ اپنے اختیار سے ہے پھر صحیح کیوں نہیں؟ اس لئے کہ جبر و اکراہ کی وجہ سے طیبِ نفس اور دل کی خوشی نہیں رہی۔

قال الامام السرخسي رحمه الله تعالىٰ: ولو أكره بوعيد قتل أو حبس حتى تزوج امرأة على عشرة آلاف درهم ومهر مثلها ألف درهم جاز النكاح لما بينا أن الجد والهزل في النكاح والطلاق والعتاق سواء فكذلك الإكراه والطواعية وللمرأة مقدار مهر مثلها **لأن التزام المال يعتمد تمام الرضا** ويختلف بالجد والهزل فيختلف أيضا بالإكراه والطوع **فلا يصح من الزوج التزام المال مكرها** إلا أن مقدار مهر المثل يجب لصحة النكاح لا محالة

(المبسوط للسرخسي ۲۴/۷۵، و نحوه في البدائع)

اس عبارت میں تصریح ہے کہ رضائے تام کے بغیر نکاح کے ذریعے شوہر سے جتنے حصے کا زبردستی التزامِ مال کرایا جاتا ہے، وہ شرعاً واجب ہی نہیں، لہٰذا بدوں طیب خاطر اس کی بیوی کے لئے یہ مال حلال نہیں۔ اسی طرح عقد مرابحہ و اجارہ کے وقت بینک کے خود ساختہ اور من گھڑت قوانین کے ذریعہ مشتری اور مستاجر سے جو التزامِ تصدق مال کرایا جاتا ہے، واضح ہے کہ اس میں بھی رضائے تام نہیں ہوتی لہٰذا یہ تصدقِ مال نہ تو شرعاً لازم ہوگا اور نہ ہی مشتری

۲۰

اور مستاجر کی طیب خاطر کے بغیر کسی کے لئے اس کا کھانا اور استعمال کرنا حلال اور جائز ہوگا۔

دیکھئے علامہ سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ نے التزامِ مال کے لئے رضائے تام کی شرط لگا کر التزامِ مال کی دو قسمیں بنائی ہیں، ایک وہ التزامِ مال جو رضائے تام کے ساتھ ہو جیسے مثلاً خوشی سے کوئی چندہ دینے کا معلق وعدہ کرے، یا اپنی خوشی سے بیوی کے لئے مہر مثل سے زیادہ مہر مقرر کر لے، تو یہ جائز، لازم اور واجب الاداء ہے اور دوسری قسم وہ ہے جس میں رضائے تام نہ ہو جیسے مثلاً زبردستی مہر زیادہ رکھوانا، یا بینک کا مرابحہ و اجارہ میں التزامِ تصدقِ مال کی شرط لگانا۔ چونکہ مشتری یا مستاجر یہ جانتا ہے کہ بدوں اس شرط کو تسلیم کئے مجھے ادھار نہیں ملے گا، لہٰذا وہ رضائے تام کے بغیر اس شرط کو قبول کرتا ہے، اس لئے یہ ناجائز، غیر لازم اور حرام ہوگا، اور اب تک بینکوں نے جتنے لوگوں سے اس عنوان کے تحت مال لیا ہے، سب کو واپس کرنا واجب ہوگا۔

تنبیہ: ''رضائے تام'' کی نفی اکراہ کے ساتھ خاص نہیں، لہٰذا اس کی نفی کے دوسرے اسباب بھی ہو سکتے ہیں، جیسے بعض اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ نے خطابِ خاص سے چندہ کو اس وجہ سے منع فرمایا ہے کہ اس صورت میں رضائے تام اور طیبِ خاطر کا یقین نہیں بلکہ ظنِ غالب یہی ہے کہ مانگنے والے کی وجاہت کی وجہ سے شرما شرمی میں بدوں رضائے تام کے دیتا ہے۔

ثالثاً: مذہب مالکیہ کے جزئیہ سے بوجوہ متعددہ زیرِ بحث مسئلہ میں استدلال درست نہیں، جس کی تفصیل عنوان ''مالکیہ کے مذہب کے جوابات'' کے تحت مذکور ہے۔

التزامِ تصدقِ مال کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں:

''میں پوری دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ یہ گذارش کرتا ہوں کہ براہ کرم اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ شروع میں جب

غیر سودی بینکاری کا آغاز ہوا تو اس قسم کا کوئی التزام گاہک سے نہیں لیا جاتا تھا، لیکن چونکہ مرابحہ میں جب ایک قیمت متعین ہو جائے تو بروقت ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں اس قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا، اس لئے لوگوں نے اس بات کا ناجائز فائدہ اٹھایا، اور بھاری رقمیں جو واجب الاداء تھیں، ان کی ادائیگی میں ٹال مٹول کر کے ادائیگی میں غیر معمولی تاخیر شروع کر دی۔ واضح رہے کہ یہ صرف بینک کا نہیں، بلکہ ان ہزاروں افراد کا نقصان تھا جن کی رکھوائی ہوئی رقموں سے یہ سارے معاملات انجام پائے تھے'' ....(غیر سودی بینکاری ص ۲۷۷)

اَقول! اولاً: اس عبارت میں سوائے عوام الناس کی ہمدردی حاصل کرنے کے، مدعا کے کس جزء کو ثابت کیا جا رہا ہے؟ اور اس پوری عبارت کے کس جزء میں دلیل بننے کی صلاحیت ہے؟

ثانیاً: احسن الفتاوی کے روئیداد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لزومِ التزامِ تصدقِ مال کی تجویز ابتداء سے رہی ہے نہ کہ بعد میں تجربہ کے بعد سامنے آئی، کیونکہ اس پر اسی مجلس میں حضرت مفتی عبد الواحد صاحب دامت برکاتہم کا اس فنڈ کو بینک سے ہٹ کر کسی تیسرے فرد کے پاس رکھنے کی تجویز اور اہلِ بینک کا اس سے انکار، اس کی واضح دلیل ہے کہ یہ بعد کی ایجاد نہیں بلکہ شروع سے ہے، کیونکہ جو کسی دوسرے کے پاس رکھنے کے لئے تیار نہیں وہ سرے سے اس کے عدم اور نہ ہونے پر کیونکر تیار ہو سکتا ہے؟

احسن الفتاوی ج ۷ ص ۱۲۱ میں نکتہ نمبر ۱۸ کے حاشیہ پر حضرت مفتی عبد الواحد صاحب دامت برکاتہم کی تجویز ان الفاظ میں نقل فرمائی گئی ہے:

''مجلس کی تجویز تو یہ ہے کہ یہ فنڈ بنک کے بجائے کسی ثالث کی تحویل میں رہے مگر بنک اپنی ہی تحویل میں رکھنے پر مصر ہے ۱۲ رشید''

لہٰذا کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں جو اس کے خلاف لکھا ہے وہ بہر حال ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

ثالثاً: اللہ تعالیٰ سے زیادہ رحم کرنے والا کوئی بھی نہیں، جب اللہ تعالیٰ نے دائن کے حق کے تحفظ کے لئے صرف دو ہی صورتیں بتلائی ہیں کہ شہادت و کتابت سے دائن کے حق کو تحفظ دو یا رہن کے ذریعہ اس کے حق کو محفوظ بناؤ...... تو ہمیں بھی انہی دو پر اکتفاء کرنا چاہیئے اور جہاں ایسا باغی شخص ہو کہ بظاہر ان دو سے قابو نہیں آتا تو اس سے بینک معاملہ ہی نہ کرے۔

مؤدبانہ مشورہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی تدابیر پر عمل کرنا چاہیئے، اس کے خلاف مذاہب اربعہ سے خروج کر کے کوئی نئی چیز ایجاد کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے۔

﴿التزامِ تصدقِ مال اور مجلس تحقیق مسائل حاضرہ﴾

''لزومِ التزامِ تصدقِ مال'' کو اس حوالہ سے کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں قوت دی گئی ہے کہ مجلس تحقیق مسائل حاضرہ نے اسے قبول کیا اور حضرت مفتی رشید احمد قدس سرہ نے احسن الفتاوی میں نقل بھی فرما دیا ہے۔

اَقول! اولاً: یہ عرض ہے کہ احسن الفتاوی میں یہ نقل ایک تجاویزی رپورٹ ہے جس میں مالہ و ماعلیہ کی گنجائش ہے۔

حضرت مفتی اعظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''بینک کو سود سے پاک کرنے اور ''بلا سود تجارتی ادارہ'' قائم کرنے کے نظام پر غور کرنے کے لئے شعبان ۱۴۱۲ھ میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کا

۳

اجلاس دارالعلوم کراچی میں ہوا جس میں حالات حاضرہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے قوانین اسلام کے تحت بحث وتمحیص کے بعد زیر نظر تجاویز تحریر کی گئیں''..........................(احسن الفتاوی ۱۱۲/ ۷)

اس تحریر سے دو باتیں معلوم ہوگئیں ایک یہ کہ بینک سود سے تب پاک ہوگا جب اس کو مستقل **تجارتی ادارہ** بنایا جائے۔

دوسری یہ کہ یہ صرف تجاویز ہیں ایسے حتمی فیصلے نہیں جن میں مزید غور کی گنجائش نہ ہو، اور غور کرنا اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کی مخالفت ہو۔

ثانیاً: حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس تجویز کو ان الفاظ سے ذکر فرمایا ہے:

''بعض علماء عصر نے اس مسئلے کے حل کے لئے یہ تجویز پیش کی، ''عمیل سے عقد مرابحہ کرتے وقت یہ لکھوالیا جائے کہ اگر وہ ادائیگی کی اہلیت کے باوجود بروقت ادائیگی نہ کرسکا تو وہ اپنے واجب الاداء دین کا ایک مخصوص فیصد حصہ ایک خیراتی فنڈ میں چندے کے طور پر ادا کریگا''۔اس غرض کے لئے بینک میں ایک خیراتی فنڈ قائم کیا جائے گا جو نہ بینک کی ملکیت ہوگا اور نہ اس کی رقوم بینک کی آمدنی میں شامل ہونگی، بلکہ اس سے ناداروں کی امداد اور ان کو غیر سودی قرضے فراہم کرنے کا کام لیا جائے گا۔ بعض مالکی فقہاء کے نزدیک ایسا التزام قضاءً بھی نافذ ہوجاتا ہے''

(احسن الفتاوی ۱۲۰/ ۷)

ان الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بطور تجویز مالکیہ کے حوالے سے یہ بات پیش کی گئی ہے، ایسا نہیں کہ اس پر گفتگو ممنوع ہو اور مخالفت اکابر کے زمرے میں داخل ہو، میرے خیال کے مطابق اس پوری عبارت میں کوئی ایسا زوردار لفظ نہیں جو اس کے حتمی فیصلہ ہونے پر

صراحۃً یا اشارۃً دلالت کرے۔

ثالثاً: یہ بات مسلم ہے کہ مجلس تحقیق میں یہ تجویز پیش ہوئی لیکن اگر اس پر سیر حاصل گفتگو ہوتی اور ان اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کی توجہ التزام اور لزوم التزام کے فرق کی طرف مبذول ہوتی تو یقیناً اس فرق کا اعتبار کرتے اور اس تجویز کو رد فرماتے۔

بحمد اللہ تعالیٰ بندہ کو اٹھارہ انیس سال حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں افتاء ہی کے شعبہ میں کام کرنے کی سعادت حاصل ہے کئی تحقیقی مسائل ایسے تھے جن کی تحقیق میں گویا حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ منفرد تھے اور آپ کو پوری طرح شرح صدر تھا اور کسی کے اختلاف کرنے سے بدلنے کو تیار نہ تھے لیکن بعض علماء کی مدلل تحریر سے کسی خاص مدار کی طرف توجہ دلائی گئی تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایسے مسائل سے بھی رجوع فرمایا۔ مثلاً شیعہ کے اہل کتاب ہونے اور مسافت سفر کا مسئلہ۔

رابعاً: خود حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے سالہا سال کے شاگرد ہونے کے باوجود بینک کے کئی مسائل میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے اختلاف فرمایا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں......

(۱) بیع الوفاء سے متعلق حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''اگر بیع کے اندر یا اس سے پہلے شرط لگائی گئی ہو یا جانبین اس عقد کو غیر لازم سمجھ رہے ہوں تو یہ بیع فاسد ہے'' (احسن الفتاوی ۶/۵۰۷)

جبکہ حضرت مدظلہ شرط قبل العقد کو مفسد نہیں مانتے، بلکہ لازم مانتے ہیں اور وہ بھی قضاءً

(غیر سودی بینکاری ۲۴۸)

(۲) حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ قرض سے استیجار کے فائدے کو سود فرماتے ہیں۔

بلٹی کے مسئلہ کے تحت فرماتے ہیں:

''تو یہ اس لئے ناجائز ہے کہ وکیل قرض سے استیجار کا نفع حاصل کر رہا ہے جو سود ہے'' (احسن الفتاویٰ ۱۷۶/۷)

جبکہ حضرت سیکورٹی ڈیپازٹ جس کو انتہاءً قرض بھی مانتے ہیں پھر بھی استیجار کے نفع کو سود نہیں فرماتے ورنہ بینکوں پر پابندی عائد فرماتے۔

(۳) کرنٹ اکاؤنٹ کو حضرت مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ناجائز فرماتے ہیں۔

سوال و جواب دونوں ملاحظہ فرمائیے!

سوال: حفاظت کی غرض سے بینک میں رقم جمع کرانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب باسم ملہم الصواب

بینک میں رقم جمع کرانے تین صورتیں ہیں:

(۱) سودی کھاتہ (سیونگ اکاؤنٹ)

(۲) غیر سودی کھاتہ (کرنٹ اکاؤنٹ)

(۳) لاکر

(الی قولہ رحمہ اللہ تعالیٰ) کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں اگرچہ سود لینے کا گناہ نہیں ہے مگر تعاون علی الاثم کا گناہ اس میں بھی ہے۔

لاکر میں جمع کرانا بھی جائز نہیں، کیونکہ اس میں سود لینے اور تعاون علی الاثم کا گناہ نہیں مگر بینک کے حرام پیسے سے بنے ہوئے خانے کے استعمال کا گناہ ہے، شدید مجبوری کے وقت اس میں رقم جمع کرائی جا سکتی ہے کہ اس

میں پہلی دو صورتوں کی نسبت گناہ کم ہے، لیکن پھر بھی استغفار لازم ہے (احسن الفتاویٰ ۱۴، ۱۵/۷)

جبکہ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ اس کو جائز فرماتے ہیں، لکھتے ہیں:

''اگر یہ ضرورت نہ ہوتی تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے کو جائز نہ کہا جاتا''

(غیر سودی بینکاری/۱۶)

﴿''لزومِ التزامِ تصدقِ مال'' کے تحت مجلس تحقیق کا فیصلہ﴾

احسن الفتاویٰ کی عبارت اور اس کے علاوہ ایک طویل بحث لکھنے کے بعد فرمایا ہے:

''بہر کیف! یہ مسئلہ مجلس تحقیق مسائل حاضرہ میں اتفاق رائے سے طے ہو گیا تھا کہ اس مسئلہ میں ان علماء مالکیہ کا قول اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے'' (غیر سودی بینکاری ۲۹۷)

اَقول! احسن الفتاویٰ کی عبارت سے یہ مستنبط کرنا کہ یہ اتفاق رائے سے طے ہوا تھا کسی بھی طرح درست معلوم نہیں ہوتا۔ پوری عبارت پر غور کرنے سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ ابتدائی تجویز کے طور پر لیا گیا تھا جس میں کلام اور رد و قدح کی وسیع گنجائش ہے۔ جیسے خود حضرت نے ''محدود ذمہ داری'' سے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ کوئی حتمی فیصلہ اور فتویٰ نہیں بلکہ ایک تجویز ہے جس پر بحث و مباحثہ کی گنجائش ہے۔

فرماتے ہیں:

''اس مسئلے کے بارے میں بندے نے جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ بات بھی صاف صاف لکھی ہے کہ یہ میری طرف سے کوئی حتمی فتویٰ نہیں ہے بلکہ یہ ایک سوچ ہے جو اہل علم کے غور کے لئے پیش کی جا رہی ہے'' (غیر سودی بینکاری ۳۳۹)

۷

دیکھئے! یہاں دوسروں (یعنی بینک کے مالکوں اور روح رواں لوگوں) نے اس ابتدائی سوچ اور تجویز کو حتمی فیصلہ اور فتوی قرار دے کر بینکوں میں بطور قانون جاری بھی کردیا جبکہ خود حضرت ابھی تک اس کو ایک ابتدائی سوچ ہی فرمارہے ہیں۔

اسی طرح ڈیجیٹل تصویر سے متعلق حضرت نے بندہ سے خود حضرت مولانا مفتی نعمت اللہ صاحب، مولانا محمد الیاس عادل صاحب، مولانا محمد عرفان صاحب (یہ تینوں صاحبان دارالعلوم کراچی کے فضلاء اور حضرت مدظلہ کے تلامذہ ہیں) اور مولانا امان اللہ مدرس جامعہ خلفائے راشدین ماری پور، وغیرہ کی موجودگی میں صراحۃً فرمایا کہ یہ ہمارا حتمی فیصلہ اور فتوی نہیں ہے بلکہ ابتدائی سوچ اور تجویز ہے......لیکن لوگوں نے اس کو بھی دارالعلوم کا فتوی سمجھ لیا اور عمل بھی شروع کردیا۔ بعینہ اسی طرح مجلس تحقیق کی رپورٹ بھی ہے کہ یہ بھی صرف تجاویز ہیں جن میں بحث کی گنجائش ہے۔ یہ اکابر رحمہم اللہ تعالی کا حتمی اور اتفاقی فیصلہ نہیں کہ اس کے خلاف لکھنے اور کہنے والے کو اکابر رحمہم اللہ تعالی کا مخالف کہا جائے۔

(۱۲) ﴿قبضِ امانت کا قبضِ ضمان میں بدون تجدید تبدیل کرنا﴾

اس عنوان کے تحت ہندوستان کے ایک معروف عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد زید باندوی صاحب مدظلہ کے ایک مقالے، جس میں انہوں نے غیر سودی بینکوں میں مرابحہ پر بحث کی ہے، سے مفصل تحریر جو قبض سے متعلق ہے، نقل فرمائی گئی ہے۔

پہلے پوری تحریر ملاحظہ فرمائیں:

تجدید قبض کی بحث

البتہ مذکورہ بالا صورت میں یہ بحث باقی رہ جاتی ہے کہ وکیل بالشراء نے جب سامان خریدا اور موکل (ادارہ) کی طرف سے بھی قبضہ کرلیا تو ظاہر

۲۸

ہے کہ یہ قبضہ بربناء وکالت موکل کی طرف سے ہوا......اور یہی وکیل جب اسی سامان کو ادارے سے خریدے گا تو مشتری ہوگا اور ادارے کی حیثیت بائع کی ہوگی۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وکیل بالشراء کا مبیع پر سابق قبضہ (جو بحیثیت وکیل تھا) حادث قبضہ کے لئے کافی ہوگا یا نہیں جو اَب بحیثیت مشتری کے ہوگا۔

﴿قبضہ کے اقسام﴾

اس سلسلہ میں فقہاء کرام نے جو ضابطہ تحریر فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ قبضہ کی دو قسمیں ہیں: قبضہ امانت، قبضہ ضمان، پھر قبضہ ضمان کی دو قسمیں ہیں: ضمان بنفسہ، ضمان لغیرہ۔ ہر ایک کا حکم جداگانہ ہے۔

۱۔ مشتری کو اگر مبیع پر پہلے سے قبضہ حاصل ہے اور وہ قبضہ ضمان بنفسہ کا ہے، مثلاً غاصب کا قبضہ شئے مغصوب پر۔ اس کا حکم یہ ہے کہ مبیع موجود ہو یا نہیں، بہرحال سابق قبضہ جدید قبضہ کے لئے کافی ہوگا اور تجدید قبضہ کی ضرورت نہ ہوگی، کیونکہ غاصب کا قبضہ ضمان بنفسہ ہے اور مغصوب شے بہرصورت مضمون بنفسہ ہے۔

۲۔ اور اگر مبیع پر مشتری کا قبضہ ضمان لغیرہ کا ہے، مثلاً شے مرہون پر راہن کا قبضہ، کیونکہ درحقیقت رہن امانت ہوا کرتا ہے البتہ مضمون بالغیر (یعنی قرض کی وجہ سے) ہوتا ہے۔ گویا یہ مضمون بنفسہ نہیں بلکہ بالغیر ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اگر شے مرہون موجود ہو تب تو یہ قبضہ جدید قبضہ کی طرف

سے کافی ہوگا ورنہ نہیں۔

۳۔ اور اگر مبیع پر مشتری کا قبضہ قبضہ امانت ہے مثلاً عاریت، ودیعت، وکالت، اجارہ کا قبضہ، کہ یہ سارے قبضے قبضہ امانت کہلاتے ہیں۔

ان کا حکم یہ ہے کہ یہ امانت والے قبضے ضمان والے قبضہ (یعنی بیع کے لئے) کافی نہ ہوں گے بلکہ تجدید قبضہ شرط ہے۔ یہ ساری تفصیل شرح و بسط کے ساتھ بدائع الصنائع میں منقول ہے۔

وَجُملَةُ الكَلامِ فِيهَا أَنَّ يَدَ المُشتَرِى قَبلَ الشِّرَاءِ إمَّا أن كَانَت يَدَ ضَمَانٍ وَإمَّا أن كَانَت يَدَ أمَانَةٍ فَإن كَانَت يَدَ ضَمَانٍ فَإمَّا أن كَانَت يَدَ ضَمَانٍ بِنَفسِهِ وَإمَّا أن كَانَت يَدَ ضَمَانٍ بِغَيرِهِ ... الى أن قال ... وَإن كَانَت يَدُ المُشتَرِى يَدَ أمَانَةٍ كَيَدِ الوَدِيعَةِ وَالعَارِيَّةِ لَا يَصِيرُ قَابِضًا

(بدائع الصنائع ج /۵ص ۲۴۸)

مذکورہ بالا تفصیل کے پیش نظر جب وکیل بالشراء کا قبضہ کرنا قبضہ امانت ہے نہ کہ قبضہ ضمان، اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ یہ قبضہ (جو بحیثیت وکیل تھا) جدید قبضہ کے لئے کافی نہ ہوجو اَب بحیثیت مشتری ہوگا بلکہ تجدید قبضہ شرط قرار دیا جائے۔ واللہ اعلم

اس لئے بہتر صورت یہ ہے کہ ادارہ کا آدمی خود مبیع پر قبضہ کرے اور دوبارہ پھر یہ مشتری جدید معاملہ کر کے بحیثیت مشتری قبضہ کرے۔ واللہ اعلم

لیکن اگر ایسا نہیں کیا جاتا بلکہ مشتری سابق قبضہ پر کفایت کرتا ہے تو یہ معاملہ درست ہوگا یا نہیں اس میں کچھ تفصیل ہے۔

﴿قبضہ وتسلیم کی حقیقت﴾

وہ یہ کہ شرعی قبضہ کا یہ مطلب نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ہاتھوں سے پکڑ لے یا مبیع کو منتقل کر کے اپنے مقام پر لے آئے۔

قبضہ کی یہ تفسیر دوسرے ائمہ شافعیہ وغیرہ کے یہاں تو ہے۔

وَقَالَ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللَّهُ : القَبضُ فِي الدَّارِ وَالعَقَارِ وَالشَّجَرِ بِالتَّخلِيَةِ .وَأمَّا فِي الدَّرَاهِمِ وَالدَّنَانِيرِ فَتَنَاوُلُهُمَا بِالبَرَاجِمِ وَفِي الثِّيَابِ بِالنَّقلِ (بدائع ج ۵ / ۲۴۴)

لیکن فقہاء احناف کے نزدیک شرعی قبضہ کا مفہوم وسیع ہے۔ ان کے نزدیک قبضہ کا حاصل صرف تخلیہ ہے، اور تخلیہ کا حاصل یہ ہے کہ بائع اور مشتری کے درمیان باعتبار حقیقت یا باعتبار عرف وعادت کے ایسا کوئی مانع اور حائل نہ ہو جو عرفی قبضہ اور تصرف کرنے سے مانع ہو بلکہ مبیع اس حال میں ہو کہ مشتری اگر اس میں تصرف کرنا چاہے تو آزادی کے ساتھ تصرف کر سکے گو مبیع ابھی بائع کے پاس ہی موجود ہو۔

وَأمَّا تَفسِيرُ التَّسلِيمِ وَالقَبضِ فَالتَّسلِيمُ وَالقَبضُ عِندَنَا هُوَ التَّخلِيَةُ وَالتَّخَلِّي وَهُوَ أن يُخَلِّيَ البَائِعُ بَينَ المَبِيعِ وَبَينَ المُشتَرِي بِرَفعِ الحَائِلِ بَينَهُمَا عَلَى وَجهٍ يَتَمَكَّنُ المُشتَرِي مِن التَّصَرُّفِ فِيهِ فَيُجعَلُ البَائِعُ مُسَلِّمًا لِلمَبِيعِ وَالمُشتَرِي قَابِضًا لَهُ.

(بدائع ج ۵ /ص ۲۴۴)

لِأنَّ مَعنَى القَبضِ هُوَ التَّمكِينُ وَالتَّخَلِّي وَارتِفَاعُ المَوَانِعِ عُرفًا وَعَادَةً وحَقِيقَةً (بدائع ج ۵ / ۱۴۸)

وَلِهٰذَا كَانَتِ التَّخلِيَةُ تَسلِيمًا وَقَبضًا فِيمَا لَا مِثلَ لَه ۔

(بدائع ج ۵ / ص ۲۴۴)

قبضہ کی اگر مذکورہ بالا تفسیر کو پیش نظر رکھا جائے جس کا حاصل بائع کی جانب سے تسلیم اور مشتری کی جانب سے قدرت ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس طرح کا قبضہ مندرجہ بالا صورت میں بھی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ وکیل بالشراء (جو بعد میں مشتری بن رہا ہے) جس کے قبضہ میں مبیع موجود ہے (مفروضہ صورت مسئولہ میں) اس کی طرف سے تسلیم تو پائی جاتی ہے، اور ادارہ کو قدرت بھی حاصل ہوتی ہے، اگر ادارہ چاہے تو مبیع میں تصرف کرے اور وکیل بالشراء اس میں کچھ نہیں کرسکتا۔ اس لئے اس صورت میں ادارہ کا قبضہ تو حکماً ہو ہی گیا، کیونکہ تخلیہ پایا گیا (گو مبیع حقیقۃً وکیل بالشراء کے قبضہ میں ہے) اس کے بعد پھر اس کا قبضہ کرنا یہ گویا قبضہ ثانیہ ہے جو بحیثیت مشتری کے ہے۔ واللہ اعلم

اور مبیع کا وکیل کے پاس ہی موجود رہنا یہ ادارہ کے قبضہ کے منافی نہیں، بہت سی صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک شے بائع کے پاس موجود ہے۔ لیکن معاملہ ہو جانے کے بعد مشتری کو اس پر قابض کہا جاتا ہے، مثلاً ذیل کے مسئلہ میں:

وَلَو اشتَرَى مِن إنسَانٍ كُرًّا بِعَينِهِ وَدَفَعَ غَرَائِرَهُ وَأمَرَهُ بِأن يَكِيلَ فِيهَا فَفَعَلَ صَارَ قَابِضًا سَوَاءٌ كَانَ المُشتَرِي حَاضِرًا أو غَائِبًا ؛ لِأنَّ المَعقُودَ عَلَيهِ مُعَيَّنٌ وَقَد مَلَكَهُ المُشتَرِي بِنَفسِ العَقدِ فَصَحَّ أمرُ المُشتَرِي ؛ لِأنَّهُ تَنَاوَلَ عَينًا هُوَ مِلكُهُ فَصَحَّ أمرُهُ وَصَارَ البَائِعُ

۳۲

وَكِيلًا لَهُ وَصَارَت يَدُهُ يَدَ المُشتَرِي . وَكَذٰلِكَ الطَّحنُ إذَا طَحَنَهُ البَائِعُ بِأمرِ المُشتَرِي صَارَ قَابِضًا (بدائع ج ۵ / ص ۲۴۷)

اس لئے مذکورہ بالا تصریح کے پیش نظر یہ کہنے کی گنجائش نظر آتی ہے کہ اگرچہ مبیع وکیل بالشراء کے پاس موجود ہے، لیکن تسلیم و تمکین کی وجہ سے حکماً (نیا) قبضہ پایا گیا اسلئے یہ صورت بھی جائز ہونا چاہئے۔

جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فقہاء نے قبضۂ امانت کو باوجودیکہ قبضۂ ضمان کے لئے کافی نہیں سمجھا، لیکن اس کے بعد ان الفاظ میں اس قسم کی صورتوں کا استثناء بھی فرمایا ہے جن میں حکماً قبضہ (قدرت تصرف) پایا جاتا ہے۔

لَا يَكُونُ قَابِضًا إلَّا إذَا ذَهَبَ المُودِعُ أو المُستَعِيرُ إلَى العَينِ وَانتَهَى إلَى مَكَانٍ يَتَمَكَّنُ مِن قَبضِهَا فَيَصِيرُ الآنَ قَابِضًا بِالتَّخلِيَةِ

(البحر الرائق ج/ ۶ ص ۸۷ ، شامی ج/ ۴ ص ۱۱۲)

لَا يَصِيرُ قَابِضًا إلَّا أن يَكُونَ بِحَضرَتِهِ أو يَذهَبُ إلَى حَيثُ يَتَمَكَّنُ مِن قَبضِهِ بِالتَّخَلِّي (بدائع ج ۵ / ص ۲۴۸)

غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانویؒ نے ثمن کے ادھار کے ساتھ بیع مرابحہ کا جواز تجدید قبضہ کے بغیر اس صورت میں تحریر فرمایا ہے جس میں مال لانے والے کی حیثیت اجیر کی ہوتی ہے اور ظاہر بات ہے کہ وہ بھی قبضہ امانت ہے۔ ملاحظہ ہو:

''عمرو نے زید کو ۹۷ روپے مال لانے کے واسطے دیئے، اور تین روپے خریداری کی اجرت دی۔ زید نے مال خرید کر اپنے ہی مکان یا دکان پر اتارا، عمرو کے مکان دکان پر نہیں اتارا۔ عمرو نے مال منگوانے کے قبل شرط

۲۳۳

کرلی تھی کہ جس وقت تم ہمارا مال جوڑ وادو گے ہم کو اختیار ہوگا، خواہ ہم تم کو دیں یا اپنے مکان پر لے جائیں اور تم کو نہ دیں، عمرو نے جوڑ نے کے بعد زید سے دریافت کیا کہ یہ مال تم کس طرح خرید تے ہو؟ زید نے کہا پانچ ماہ کے لئے لیتا ہوں اور اٹھارہ روپے کے منافع سے دونگا۔

جواب: یہ بیع مرابحہ بتأجیل الثمن ہے اور بقیو دِ مذکورہ سوال درست ہے۔

(امداد الفتاوی ج/۳ص ۴۲، سوال ۳۹)

خلاصۂ کلام

یہ کہ صورتِ مسئولہ میں وکیل بالشراء کا اس مبیع کو مؤکل سے خرید لینے میں کوئی حرج نہیں اور ابتداءً اس کا قبضہ قبضۂ وکالت منجانب مؤکل تھا اور ثانیاً اس کا قبضہ بحیثیت مشتری تھا۔ تجدید قبضہ شرط ضرور ہے لیکن حکمی و معنوی طور سے قبضۂ ثانیہ پایا جاتا ہے۔

اور جس طریقہ سے بائع مشتری کا وکیل بن سکتا ہے، اور یہ وکیل بنانا ہی قبضہ کے قائم مقام ہوتا ہے، جیسا کہ ماقبل کی بدائع کی عبارت میں گزرا، اسی طرح وکیل بالشراء کا مشتری بننا اور مؤکل کا بائع بننا بھی درست ہوگا۔ یعنی جس طریقہ سے وکالت اور بیع وشراء علی سبیل التعاقب بغیر کسی فصل و حقیقی تجدید قبضہ کے بغیر جمع ہو سکتے ہیں، اسی طرح یہاں بھی وکالت اور بیع وشراء بغیر کسی فصل وتجدید قبضہ کے جمع ہو جائیں گے۔ واللہ اُعلم۔''

(جدید فقہی مباحث، بحث المرابحۃ، مقالہ از مفتی محمد زید باندوی صاحب ج:۳ص:۴۸۳تا ۴۸۸،طبع: ادارۃ القرآن)

(غیر سودی بینکاری صہ ۲۲۸ تا ۲۳۳)

۳۴

اس تحریر سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وکیل بالشراء کا قبضہ (جس نے پہلے اس شیء پر بحیثیت وکیل اماناً قبضہ کیا تھا اب اس کا اپنے لئے قبضۂ ملک بدوں موکل کو لوٹائے) صحیح ہے۔

اُقول! اولاً: تو حضرت باندوی مدظلہ کی تعمیمِ قبض جو''قدرتِ تصرف'' کے عام مفہوم سے فرما چکے ہیں، یقین ہے کہ مجوزین حضرات کی علمی دیانت بھی اس سے آبی ہوگی۔

ثانیاً: اس تعمیم کے پیش نظر مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے مبیع کے ہلاک ہونے کا ضمان عادۃً کبھی بھی بائع پر نہیں آئے گا۔

ثالثاً: صفحہ نمبر ۲۳۲ پر بدائع کی جو عبارت علامہ باندوی مدظلہ نے نقل فرمائی ہے اس میں ''غرائرہ'' اور ''طحن'' کی شرط لغو ہونی چاہیے کیونکہ اس سے پہلے ''قدرتِ تصرف'' کے عام مفہوم سے قبضہ ہو چکا، اگر لغو نہیں تو یہ تعمیم باطل، اور امید ہے کہ حضرت مدظلہ بھی علامہ باندوی مدظلہ کے لحاظ میں بدائع کی شرط کو لغو نہیں فرمائیں گے۔

جب بدائع کی عبارت نے ساتھ نہیں دیا تو اب اس عبارت پر تفریع کرتے ہوئے یہ فرمانا ''اس لئے مذکورہ بالا تصریح کے پیش نظر یہ کہنے کی گنجائش نظر آتی ہے کہ اگر چہ مبیع وکیل بالشراء کے پاس موجود ہے لیکن تسلیم وتمکین کی وجہ سے حکماً (نیا) قبضہ پایا گیا اس لئے یہ صورت بھی جائز ہونی چاہیئے''، کسی طرح بھی درست نہ ہوگا۔

رابعاً: صاحب البحر اور علامہ شامی رحمہما اللہ تعالیٰ کی عبارات سے بھی جو نتیجہ نکالا گیا ہے وہ بھی تسامح ہی تسامح ہے اور ظن غالب ہے کہ مجوزین حضرات میں سے کوئی بھی اس سے انکار نہیں فرمائیں گے۔ اگر صاحب بحر اور علامہ شامی رحمہما اللہ تعالیٰ کی اس عبارت سے ''قدرتِ تصرف'' کا عام مفہوم ثابت ہوتا تو'' **الا اذا ذهب المستعير الى العين** '' اور

۵

" انتھی الی مکان " کی شرط نہ ہوتی کیونکہ ان شرائط کے بغیر بھی تو ''قدرتِ تصرف'' بالمعنی العام پایا جارہا ہے۔ معلوم ہوا کہ علامہ ابن نجیم اور علامہ شامی رحمہما اللہ تعالیٰ کی عبارت بھی ساتھ نہیں دے رہی، لہٰذا اس سے بھی اپنے مطلب کا نتیجہ نکالنا کسی طرح درست نہیں۔

خامساً: آخر میں بدائع کی عبارت بھی دعویٰ کے خلاف ہے کیونکہ " الا أن یکون بحضرتہ " اور " أو یذھب الی حیث یتمکن من قبضہ " کی شرط دعوے کی تردید کر رہی ہے۔ کیونکہ قبض بمعنیٰ ''قدرتِ تصرف'' ان شرائط کے بغیر بھی پایا جارہا ہے تو بلا وجہ ان شرائط کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ ان کے ذکر کا فائدہ کیا ہے؟

سادساً: حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتویٰ کا جو مدار بتایا گیا ہے وہ بھی درست نہیں کیونکہ موکل نے جوڑنے (شمار کرنے) کے بعد زید سے دریافت کیا کہ یہ مال تم کس طرح خریدتے ہو الخ (غیر سودی بینکاری ۲۳۳)

تو موکل کا اپنے لئے شمار کرنا یہ اس کا قبضہ ہے لہٰذا اس سے اجیر کا امانتاً قبضہ ختم ہو گیا اب بیع کے بعد جو قبضہ ہوگا وہ جدید قبضہ ہوگا۔

افسوس اتنی واضح عبارت اور پھر بھی حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ دیدہ دانستہ اتنی بڑی غلط بات لگانا کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟

سابعاً: صفحہ نمبر ۲۳۳ پر ''خلاصۂ کلام'' کے تحت جو نتیجہ نکالا ہے وہ بھی بالکل غلط ہے کیونکہ بائع کا جو وکیل مشتری بنتا ہے اس میں ایک تو یہ ہے کہ بائع کا قبضہ قبضۂ ضمان ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ وکیل کی حیثیت سے جب عمل کرے گا یعنی بوروں میں جب غلہ بھرے گا یا پسوائے گا تو قبضہ شمار ہوگا، جب موکل کے لئے یہ عمل کیا تو اس عمل کی وجہ سے قبضہ ہو گیا۔ اگر صرف وکیل بنانے سے قبضہ تام ہوتا تو عمل کی شرط نہ لگاتے، جبکہ صورتِ زیرِ بحث میں

۳۶

پہلا قبضہ قبضۂ امانت ہے نہ کہ قبضۂ ضمان اور دوسرا قبضۂ ضمان ہے، جو کہ پہلے سے قوی ہے اور بناء الضعیف علی القوی کی تو مثالیں ملتی ہیں جبکہ بناء القوی علی الضعیف کو ہر جگہ درست کہنا شاید مشکل ہو۔

﴿مبیع کا بینک کے ضمان میں آنا﴾

''مبیع کا بینک کے ضمان میں آنا'' کے عنوان کے تحت بینک اور خریدار کے مابین مرابحہ اگریمنٹ کی وہ شق جس میں خریدار بینک سے مرابحۂ خریداری کا وعدہ کرتا ہے، کا ترجمہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہم آپ سے وہ اثاثے فوراً مرابحہ کی بنیاد پر خرید لیں گے اور اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ کسی ایسے حقیقی نقصان کی ہم تلافی کریں گے'' جو وہ اثاثے کسی تیسرے فریق کو بیچنے کے نتیجے میں آپ کو پہنچے بشرطیکہ وہ متوقع نفع کا نقصان نہ ہو'' (غیر سودی بینکاری صہ ۲۲۴)

اُقول! یہ شرط کہ ''ہم آپ سے وہ اثاثے فوراً مرابحہ کی بنیاد پر خرید لیں گے اور اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ کسی ایسے حقیقی نقصان کی ہم تلافی کریں گے'' مفسد عقد ہے یا نہیں؟ فوراً کی مدت کیا ہے؟ یہ جہالت مفضیہ الی النزاع ہے یا نہیں؟ (بشرطیکہ کوئی حق بات سننے کے لئے تیار ہو ورنہ ظالم کی کوئی شرط بھی مفضی الی النزاع نہیں، کیونکہ مظلوم کو زبان ہلانے کی بھی اجازت نہیں)

آگے فرماتے ہیں: ''اب سنئے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟...... اگر وہ وکیل کی تعدی کے بغیر ہلاک ہو جائے یا اس میں کمی آجائے تو نقصان بینک کا ہو''

(غیر سودی بینکاری ۲۲۵)

۷

اُقول! فرماتے ہیں: کمی ہوجائے تو نقصان بینک کا ہو......حالانکہ پہلے اصل عبارت میں فوراً خریدنے کی شرط کا حیلہ خود بینک کو اس مقصد کے لئے بتایا ہے تاکہ اچانک کم ہونے کی صورت میں کمی کے نقصان سے بینک کو بچایا جائے۔

﴿خریداری کے بعد ایجاب وقبول کے دستاویز کی شرعی حیثیت﴾

''مرابحہ کے وقت لاگت اور قیمت کا تعین'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ وکالۂ خریداری کے بعد باقاعدہ مشتری کی طرف سے ایجابِ بیع کے کاغذات جاتے ہیں اور پھر بینک اسے قبول کرکے فروخت کرتے ہیں اور دستخط ثبت کرتے ہیں اور پھر یہ کاغذات مشتری کو ملتے ہیں (ملخصاً من غیر سودی بینکاری ۲۲۱،۲۲۲)

اُقول! اولاً: تو یہ پوچھنا ہے کہ یہ کاغذات بائی ڈاک جاتے ہیں یا دستی ہوتے ہیں؟

ثانیاً: اس دستاویز کی تکمیل کے لئے کوئی مدت شرط ہے یا نہیں؟

ثالثاً: اگر شرط ہے تو کمی بیشی کی صورت میں بیع اور مبیع کے ضمان پر کچھ اثر پڑیگا یا نہیں؟

رابعاً: وکالۂ خریداری کے ایجاب کے دستاویز کے جانے اور قبول کے دستاویز کے واپس آنے کے زمانے میں مبیع کہاں، کس کے قبضہ اور کس کے ضمان میں ہوتا ہے؟

خامساً: بینک نے جس بائع سے بواسطہ وکیل مال خریدا ہے، بینک کے بائع بننے کے بعد یہ مال بائع اول کے گودام اور شوروم میں امانۃً ہوتا ہے یا ضماناً؟ ان تمام تفصیلات کے بعد ایجاب وقبول کے دستاویز کی شرعی حیثیت صحیح طور پر معلوم ہوسکے گی۔

﴿مرابحہ بنوکیہ اور مرابحہ شرعیہ میں واضح فرق﴾

مرابحہ شرعیہ شروط فاسدہ سے پاک اور ابتداء تا انتہاء شرعی جواز سے آراستہ اور حقیقی

۳۸

تراضیِ جانبین پر مبنی ایک اسلامی عقد ہے، جبکہ مرابحہ بنوکیہ شروط فاسدہ سے آلودہ، شرعی جواز سے محروم اور جبری تراضی پر مبنی ایک غیر اسلامی عقد ہے۔

''مرابحہ کا عملی طریقۂ کار'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بینک کے پاس کوئی سامان موجود نہیں ہوتا بلکہ اس کے پاس جس چیز کا گاہک آتا ہے اسے خرید کر گاہک کو بیچتا ہے ظاہر ہے کہ اگر خرید کر اپنی ملکیت اور ضمان میں لاکر بیچے تو اس پر کوئی فقہی اشکال نہیں ہوسکتا، میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دیوبند میں یہی سوال پوچھا گیا تھا۔ یہ سوال و جواب درج ذیل ہیں:

سوال (۷۳۵) موجودہ وقت میں تجارت کا عام طور پر یہ قاعدہ ہورہا ہے کہ لوگ اپنے کو تاجر بتلاتے ہیں اور کسی کسی چیز کی تجارت بھی کرلیتے ہیں لیکن باقاعدہ دکان وغیرہ نہیں رکھتے جب کوئی فرمائش کسی شخص کی آتی ہے تو بازار سے مال خرید کر اس پر اپنا نفع قائم کرکے خریدار کو بھیج دیتے ہیں، کیا یہ منافع جائز ہیں؟

الجواب: اگر اس میں کوئی دھوکہ نہ کیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ یہاں کے بازار کا یہی نرخ ہے تو منافع جائز ہیں، البتہ بہت زیادہ نفع اس پر لگا کر بہت گراں فروخت کرنا مروت کے خلاف ہے اس لئے اچھا نہیں اور فتاوی بزازیہ میں بعض ائمہ حنفیہ (رحمہم اللہ تعالی) سے زیادہ گراں فروخت کرنے کی کراہت نقل کی ہے۔''

(امداد المفتین ۸۴۴، بحوالہ غیر سودی بینکاری ۲۰۹،۲۱۰)

۹

أقول! حضرت مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ نے جس سوال کا جواب دیا ہے اس سوال میں اور مرابحہ بنوکیہ میں زمین وآسمان کا فرق ہے، تعجب ہے کہ اتنے بڑے فرق کو کیسے نظر انداز کیا گیا؟ مرابحہ بنوکیہ کا جواب امداد الفتاوی میں ہے، ذرا سوال و جواب دونوں ملاحظہ فرمائیں:

''سوال (۳۴): عمرو نے زید سے کہا تم مجھ کو یک صد روپیہ کا مال جفت پاپوش منگادو، میں تم سے...... کا منافع دے کر ادھار ایک ماہ کے واسطے خرید کرلوں گا یا جس قدر مدت کے واسطے تم دو گے اسی حساب سے منافع دوں گا یعنی پانچ روپے یک صد روپیہ کا منافع ایک ماہ کے واسطے ہے، جب مال آجاوے گا اس وقت مدت ادھار اور منافع کی متعین ہوجاوے گی۔ اس کے جواب میں زید نے کہا کہ میں منگادوں گا مگر اطمینان کے واسطے بجائے یک صد کے دوصد کا رقعہ لکھاؤں گا تاکہ تم خلاف عہدی نہ کرو، عمرو نے منظور کیا؟

الجواب: اس میں دو مقام قابل جواب ہیں ایک یہ کہ زید وعمرو میں جو گفتگو ہوئی یہ وعدۂ محضہ ہے کسی کے ذمہ بحکم عقد لازم نہیں اگر زید کے منگانے کے بعد بھی عمرو انکار کردے تو زید کو مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں پس اگر عرف وعادت میں عمرو مجبور سمجھا جاتا ہو تو یہ معاملہ حرام ہے ورنہ حلال الخ''(امداد الفتاوی ۳/۴۰)

أقول! مرابحہ بنوکیہ ایسے وعدوں میں جکڑا ہوا ہے جن کا پورا کرنا بقول حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ لازم نہیں، بلکہ پورا کرنے کو لازم سمجھنا حرام ہے۔ مشتری کو نہ لینے کا حق

۴۰

ہوتا ہے، منافع میں کمی زیادتی کا اختیار ہوتا ہے اور ثمن واقعی سے زیادہ لینا حرام ہوتا ہے۔

تنبیہ: امداد المفتین کے سوال وجواب میں نہ اس قسم کی شروط کا ذکر ہے اور نہ ان کے حکم کا، جبکہ بینکوں کے مرابحہ میں یہ ساری شرطیں موجود ہیں۔

﴿مرابحہ اور سودی قرض میں فرق﴾

اس عنوان کے تحت فرماتے ہیں:

''دونوں میں متعدد فرق ہیں جو درج ذیل ہیں۔

''(۱) سودی قرض میں بینک کو اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ قرض لینے والا اس قرض کو کہاں استعمال کرے گا۔ یہ قرض کسی بھی مقصد کے لئے لیا جاسکتا ہے چنانچہ بسا اوقات یہ قرض اپنے واجب الاداء بلوں کی ادائیگی کے لئے کبھی اپنے ملازمین کو تنخواہیں دینے کے لئے اور کبھی اپنی ذاتی ضروریات میں خرچ کرنے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف مرابحہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب بینک کے گاہک کو واقعی کوئی چیز خریدنی ہو لہٰذا مرابحہ نہ بلوں کی ادائیگی کے لئے استعمال ہوسکتا ہے نہ تنخواہیں دینے کے لئے نہ اوورڈرافٹ کے لئے یہ اسی صورت میں استعمال ہوگا جب واقعی کوئی خریداری مقصود ہو''

(غیرسودی بینکاری صہ ۲۳۵)

أقول! مرابحہ ان مقاصد کے لئے کیوں استعمال نہیں ہوسکتا؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ بینک سے کوئی چیز مرابحہ پر لے اور جس سے بینک کا وکیل بن کر لیا تھا اسی کو واپس کر کے بینک کا دیا ہوا پیسہ لے کر ان مقاصد کے لئے استعمال کرے جیسے بیع عینہ والے کرتے ہیں بینک کو تو عینہ

۴۱

وغیرہ سے کوئی بھی تعلق نہیں بلکہ بینک کو تو مال کے کاغذات کے علاوہ اصل مال دیکھنے اور اس کے موجود ہونے کی بھی نہ ضرورت نہ حاجت۔

نیز یہ بھی عین ممکن ہے کہ کسی فیکٹری میں مال پڑا ہوا موجود ہو لیکن تنخواہوں کی رقم موجود نہ ہو اور اس کے کئی شریک ہوں جن میں سے بعض عارضی طور پر بینک سے رقم وصول کرنے کے لئے پوری فیکٹری کے مالک بن چکے ہوں اور بعض مال کے مالک، اسی طرح وہ بینک سے پیسے نکلوا کر تنخواہوں وغیرہ دوسری ضرورتوں میں استعمال کریں......فرق صرف اتنا ہوگا کہ سودی بینک ان کاموں کے لئے براہ راست رقم دیتے ہیں اور یہ بالواسطہ......اور اس فرق کا اثر جواز اور عدم جواز پر کتنا پڑتا ہے؟ یہ اپنی جگہ ایک مستقل بات ہے، اگر اس کو سود سے بچنے کا حیلہ کہا جائے تو جائز اور سود کھانے کا حیلہ کہا جائے تو حرام! جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''اس لئے سود حاصل کرنے کے لئے کوئی حیلہ اور تدبیر اختیار کرنا ممنوع ہے، اور سود سے بچنے کے لئے تدبیر اختیار کرنا درست ہے''

(فتاویٰ محمودیہ ۲۲۴ تا ۲۲۶ ط: قدیم، غیر سودی بینکاری ۲۰۶، ۲۰۷)

''**(۳)** مرابحہ میں چونکہ بینک کوئی چیز خرید کر بیچتا ہے، اس لئے وہ چیز پہلے اس کے ضمان میں آتی ہے، اور آگے بیچنے سے پہلے اگر وہ ہلاک ہو جائے تو نقصان بینک کو اٹھانا پڑتا ہے، جبکہ سودی قرضوں میں بینک اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ عام طور سے بینک کے قبضہ میں اس چیز کے رہنے کا دورانیہ بہت مختصر ہوتا ہے'' (غیر سودی بینکاری/۲۳۶)

اَقول! دونوں میں عادۃً ہلاکت کا خطرہ نہیں ہوتا صرف امکانی احتمال کے درجہ میں اسلامی بینک میں ہلاکت کا خطرہ ہوگا کیونکہ یہ انحصار اتنا ہوتا ہے جس میں عادۃً ہلاکت کا

احتمال نہیں ہوتا، اور شاید شرعاً یہ معتبر ہی نہ ہو۔

آگے فرماتے ہیں:

''لیکن بعض صورتوں میں یہ وقفہ کافی لمبا بھی ہو جاتا ہے اور ایسی صورتیں عملاً پیش آتی ہیں کہ بینک کو اس چیز کی تباہی کا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے'' (حوالہ بالا)

اَقول! مجوزین حضرات نے بینک کو ہر چھوٹے بڑے نقصان سے بچانے کے لئے جو تدابیر بتلائی ہیں ان کے پیش نظر تو عملاً ایک بار بھی نقصان نہیں ہونا چاہیے...... جب چھوٹے نقصان سے بینک کو مکمل تحفظ دے چکے تو بڑے نقصان سے تو بطریق اولیٰ تحفظ دے چکے ہونگے، بلکہ دے چکے ہیں، اور وہ اس طرح کہ ''تکافل'' کے نام سے بیمہ کو قائم فرمایا۔ بینک ''تکافل'' کا پورا خرچہ مع نفع/سود، گاہک ہی کے ذمہ ڈالتا ہے اور ہلاکت کی صورت میں تکافل سے وصول کرتا ہے تو بینک کو نقصان کب ہوتا ہے؟

''**(۴)** سودی قرضوں میں اگر مقروض شخص اپنا قرض ادا نہ کرے تو اس کا سود بڑھتے رہنے کی وجہ سے بینک کی آمدنی مسلسل بڑھتی جاتی ہے غیر سودی بینکاری میں اگرچہ مقروض تنگ دستی کی وجہ سے بروقت ادائیگی نہ کر سکے تو اسے کوئی اضافی رقم دینی نہیں پڑتی البتہ اگر مالدار ہونے کے باوجود بروقت ادائیگی نہ کرے تو اسے تاخیر کے مطابق رقم صدقہ کرنی پڑتی ہے مگر اس سے بینک کی آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا''

(غیر سودی بینکاری/۲۳۶)

اَقول! یہ بھی درحقیقت نام ہی کا فرق ہے کسی مذہب میں لزوم التزامِ صدقہ بوقت

۲ ۳

مرابحہ واجارہ جائز نہیں۔ یہ طیب خاطر کے بغیر صرف صدقہ کے نام سے لوگوں پر ڈاکہ ڈالنا اور جبراً ان کے مال کو باطل طریقہ پر ہڑپ کرنا ہے نیز یہ کہنا کہ اس سے بینک کی آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا محلِ کلام ہے کیونکہ علماء نے جب بینک کو مشورہ دیا تھا کہ ''یہ فنڈ بینک کی بجائے کسی ثالث کی تحویل میں رہے'' تو بینک نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور اپنی ہی تحویل میں رکھنے پر مُصر رہا۔

علماء کی اس تجویز کو رد کرنا اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اس میں بینک کا نفع ضرور ہے ورنہ جمع کرنے اور پھر خیراتی کاموں میں صرف کرنے کا بوجھ ہرگز ہرگز نہ اٹھاتا......لہٰذا یہ فرق صرف زبانی جمع خرچ ہی لگتا ہے۔

''**(۵)** سودی بینکوں میں ایک شخص سودی قرض لے کر جو ناجائز اور حرام کام کرنا چاہے، کرسکتا ہے سودی بینک کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا لیکن غیر سودی بینکاری میں مرابحہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب خریدی جانے والی چیز شرعاً حلال ہو چنانچہ ایسی چیزوں کی خرید وفروخت مرابحہ کے ذریعے ممکن نہیں ہے جن کو ملکیت میں لانا شرعاً حرام یا ناجائز ہے، مثلاً سینما، لاٹری کے ٹکٹ، سودی اداروں کے حصص یا سودی بانڈ وغیرہ

(غیر سودی بینکاری/۲۳۶)

اُقول! اولاً: پہلا سوال یہ ہے کہ کیا مقرِض مطلق کو مستقرض کے ان منکرات کی وجہ سے گناہ ہوگا؟

ثانیاً: دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا مرابحہ کو عینہ یا جعلی کارروائی کے ذریعہ نقد رقم کے وصول کا ذریعہ بنا کر پھر ان نقود کو خلاف شرع امور میں استعمال کرنا جائز ہے؟ کان اِدھر سے پکڑ دیا

اُدھر سے......

''**(۶)** سودی بینکوں میں جو قرضے جاری کئے جاتے ہیں چونکہ ان کا حقیقی اثاثوں سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہوتا اس لئے وہ اُس مصنوعی زر پیدا کرنے کا بہت بڑا سبب ہوتے ہیں جن کے پیچھے کوئی حقیقی مالیت نہیں ہوتی اور جس کی وجہ سے پوری دنیا کی معیشت ایک غبارہ کی شکل اختیار کر گئی ہے، مرابحہ میں یہ ممکن ہی نہیں ہے'' (غیر سودی بینکاری/۲۳۷)

اُقول! بے شک!......لیکن اس مرابحہ میں ممکن نہیں جو سود کھانے کے لئے بطور حیلہ استعمال نہ ہوتا ہو اور جس مرابحہ کو سود کھانے کے لئے بطور حیلہ کے استعمال کیا جاتا ہو اس میں اور سودی قرضوں میں سارا کا سارا بوجھ گاہک اور خریدار پر برابر پڑتا ہے۔

اگر آج کوئی اسلامی اسکالر مرابحہ سے ہٹ کر کوئی اور آسان صورت سود کھانے کی بتا دے تو یقیناً بینک فوراً لبیک کہے گا اور مرابحہ کو ٹھوک پھینک دے گا...... کیونکہ اس کا مقصد تجارت اور مرابحہ واجارہ ہے ہی نہیں بلکہ بینک بے چارہ تو بوجہ مجبوری ان مرابحات و اجارات کے حیلوں کے بکھیڑوں میں گرفتار ہے۔

الحاصل حقیقی اور اصلی مرابحہ اور سودی قرض میں تو زمین آسمان کا فرق ہے لیکن مرابحہ بنوکیہ اور سودی قرض میں فرق بتلانا شاید کہ قبول نہ افتد۔

''**(۷)** سودی قرضوں میں ہر وقت یہ بات ممکن ہے کہ بینک اپنے واجب الوصول قرضے کسی دوسرے کو بیچ دے اور سودی اداروں میں قرضوں کی خرید وفروخت کا عام چلن ہے، لیکن مرابحہ میں جو رقم واجب الاداء ہوتی ہے، وہ شرعاً کسی اور کو فروخت نہیں کی جاسکتی اور اس طرح قرضوں کی خرید وفروخت سے جو سنگین خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور جو موجودہ

۵

معاشی بحران کا بہت بڑا سبب ہیں، مرابحہ کے عقود ان سے پوری طرح محفوظ ہیں'' (غیر سودی بینکاری/۲۳۷)

اُقول! مرابحہ بلکہ اجارہ کے ذریعہ حاصل ہونے والی اشیاء اوران کی اقساط کا، بینک کے ناقص نظام کی وجہ سے دوسرے پر فروخت کرنا اور اُس کے ذمہ کی طرف منتقل کرنا عام معمول ہے بلکہ اِس کے سدّ باب کے لئے بینک کے پاس کوئی نظام اور تدبیر ہی نہیں ہے۔

''**(۸)** سودی بینکوں میں قرض لینے والے سرمایہ دار اپنی سہولت کے لئے بینک سے دن رات یہ معاملہ کرتے رہتے ہیں کہ قرض کی میعادیں اور قسطیں بدل کر ہمارے سود میں کمی اور اضافہ کردو جسے Rescheduling کہا جاتا ہے۔ مرابحہ میں جو قیمت ایک مرتبہ متعین ہوگئی، وہ ہمیشہ کے لئے متعین رہتی ہے اور اس میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی.................... (غیر سودی بینکاری/۲۳۷)

اُقول! مرابحہ اور اجارہ میں وہ مجبور لوگ جن کے پاس پہلے رقم نہیں تھی بعد میں آ گئی اس وجہ سے وہ اپنی قسطیں جلدی ختم کروانا چاہتے ہیں ان کو اجازت دینا چاہئے نیز اس کے جواز کی کوئی صورت بھی محنت کرکے ڈھونڈ لانا چاہئے۔

﴿مفروضہ شخص قانونی﴾

شخص قانونی کے تصور کی شرعی حیثیت کی بحث کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ نے اپنی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' میں چار نظائر پیش فرمائے ہیں، پہلے حضرت والا کے الفاظ میں وہ نظائر ملاحظہ فرمائیں:

''پہلا مسئلہ یہ ہے کہ شرکت کا الگ سے کوئی قانونی وجود نہیں ہوتا، مگر کمپنی کا

۲۴۶

اپنا مستقل قانونی وجود ہوتا ہے جس کو ''شخص قانونی'' کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شخص قانونی کا تصور شرعاً درست ہے یا نہیں؟............ جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں گو ''شخص قانونی'' کی اصطلاح موجود نہیں، لیکن اس کے نظائر موجود ہیں۔

''شخص قانونی'' کے نظائر

۱۔ **وقف:** اس کے لئے اگرچہ شخص قانونی کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی، مگر حقیقت میں یہ ایک شخص قانونی ہے، اس لئے وقف مالک ہوتا ہے، مسجد یا وقف کو چندہ دیا جائے یا کوئی اور چیز دی جائے تو وہ چندہ یا دیگر عطیات وقف نہیں ہوتے جب تک کہ ان کے وقف ہونے کی تصریح نہ کردی جائے، بلکہ وقف کے مملوک ہوتے ہیں اور وقف مالک ہوتا ہے۔ وقف دائن بھی ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص وقف کی زمین کرایہ پر لیتا ہے تو یہ کرایہ وقف کا دین ہے اور وقف دائن ہے۔ ایسے ہی وقف مدیون بھی ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص وقف کا ملازم ہے تو اس کی تنخواہ وقف کے ذمے دین ہے، عدالت میں مقدمہ ہو تو وقف مدعی اور مدعا علیہ بھی ہوسکتا ہے، اور متولی اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ مالک ہونا، دائن ہونا، مدیون ہونا، مدعی یا مدعا علیہ ہونا شخص کے اوصاف میں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ وقف میں ''شخص قانونی'' کی خصوصیات تسلیم کی گئی ہیں، گو فقہاء نے یہ اصطلاح استعمال نہیں کی۔

۲۔ **بیت المال:** بیت المال کے مال سے پوری قوم کا حق تو متعلق ہے، مگر ہر شخص اس مال میں ملک کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اس مال کا مالک بیت المال

ے

ہی ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ بیت المال بھی ایک ''شخص قانونی'' ہے، بلکہ فقہاء کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال کی ہر مد ایک مستقل ''شخص قانونی'' ہے۔ بیت المال کے دو الگ الگ حصے ہیں، بیت مال الصدقہ، اور بیت مال الخراج، امام زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ لکھا ہے کہ اگر ایک حصے میں مال نہ ہو تو بوقتِ ضرورت دوسرے حصے سے قرض لیا جاسکتا ہے۔ تو اس صورت میں جس حصے سے قرض لیا گیا وہ دائن اور جس حصے کے لئے قرض لیا گیا وہ مدیون ہوگا۔ دائن یا مدیون تو شخص ہوا کرتا ہے، معلوم ہوا کہ بیت المال کو بھی ''شخص'' فرض کر لیا گیا ہے۔

۳- ترکۃ مستغرقۃ بالدین : کسی میت کا سارا ترکہ دیون سے مستغرق ہو تو اس صورت میں دائنین کا مدیون نہ میت ہے، اس لئے کہ مرنے کے بعد کوئی شخص مدیون نہیں ہوتا، اور نہ ورثہ مدیون ہیں، اس لئے کہ ان کو تو میراث ملی ہی نہیں، لہٰذا یہاں مدیون ترکہ ہوگا جو ''شخص قانونی'' ہے۔

۴- خلطۃ الشیوع : یہ نظیر حنفیہ کے مذہب کے مطابق نہیں، بلکہ ائمہ ثلاثہؒ کے مذہب کے مطابق ہے، ان کے ہاں مالِ زکوۃ کئی شخصوں میں مشاع طور پر مشترک ہو تو زکوۃ انفرادی حصوں پر نہیں، بلکہ مجموعے پر ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ائمہ ثلاثہؒ کے ہاں مجموعہ ایک ''شخص قانونی'' ہے......

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ''خلطۃ الشیوع'' اور کمپنی کے نظام میں یہ فرق ہے کہ ''خلطۃ الشیوع'' میں ائمہ ثلاثہؒ کے ہاں مجموعے پر زکوۃ ہوتی ہے، پھر ہر شریک کی انفرادی ملکیت پر زکوۃ نہیں ہوتی، اور کمپنی پر

الگ ٹیکس ہوتا ہے، اور شیئرز ہولڈرز پر الگ ٹیکس ہوتا ہے۔

ان نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ ''شخص قانونی'' کا تصور فی نفسہ کوئی ناجائز تصور نہیں ہے، اور نہ فقہ اسلامی کے لئے کوئی اجنبی تصور ہے، البتہ یہ اصطلاح ضرور نئی ہے۔

(اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص۸۰ تا ۸۱، ط مکتبہ معارف القرآن کراچی)

اَقول! بینک کی عمارت کے لئے شخص قانونی کا فرض کرنا اساسی اور بنیادی ستون کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعہ کئی خلاف شرع امور کا جواز ثابت کیا گیا ہے حتی کہ انشورنس اور قمار جیسے حرام کو بھی اس کی بنیاد پر جائز کہا گیا ہے نیز اس فرضی شخص کو اخذ وعطاء وغیرہ افعال وتصرفات جو فاعل مختار وحقیقی موجود کے افعال وتصرفات ہیں، کی طرف منسوب کر کے اصل شرکاء کو ان سے سبکدوش کیا ہے۔

﴿شخصِ قانونی کے ثبوت کے نظائر کے جوابات﴾

شخص قانونی کے ثبوت پر جن نظائر سے استدلال کیا گیا ہے، ان کا تفصیلی جواب ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

نظیر نمبر (۱۔۲) : وقف اور بیت المال

کہا گیا ہے کہ جس طرح وقف اور بیت المال کی طرف اخذ وعطاء، اور دائن ومدیون بننے کی نسبت کی جاتی ہے اور شریعت نے اس کو درست تسلیم کیا ہے اسی طرح شخص قانونی کو بھی تسلیم کیا جائے۔

جواب: دونوں میں کئی اساسی اور بنیادی فرق موجود ہیں لہذا دونوں کو ایک حکم دینا درست نہیں۔

٤٩

فرق نمبر(١) : وقف اور بیت المال میں اموال کسی انسان ذی روح کے مملوک نہیں ہوتے، جیسا کہ خود حضرت مدظلہ نے لکھا ہے۔ جبکہ بینک میں شرکاء بقدر رأس المال بینک کے اثاثوں اور دوسرے اموال کے مالک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناکامی کی صورت میں اثاثے اور جملہ اموال ان شرکاء میں بقدر حصص تقسیم ہوتے ہیں۔ جبکہ خراب وقف میں یہ حکم نہیں۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ : (قوله : و عندهما هو حبسها علی) حکم (ملک الله تعالیٰ)قدر لفظ حکم لیفید أن المراد أنه لم یبق علی ملک الواقف و لا انتقل الی ملک غیره بل صار علی حکم ملک الله تعالیٰ الذی لا ملک فیه لأحد سواه و الا فالکل ملک لله تعالی .

(الشامیة ٤/٣٣٨،ایچ ایم سعید)

و قال رحمه الله تعالیٰ أیضا :(قوله :و لو خرب ما حوله و استغنی عنه یبقی مسجدا عند الامام و الثانی و به یفتی و عاد الی الملک) أی ملک البانی أ و ورثته (عند محمد) ...... لکن عند محمد انما یعود الی ملکه ما خرج عن الانتفاع المقصود للواقف بالکلیه ، کحانوت احترق و لا یستأجر بشیء و رباط و حوض محلة خرب ، و لیس له ما یعمر به ، و أما ما کان معدا للغلة فلا یعود الی الملک الا نقضه و تبقی ساحته وقفا توجر ، و لو بشیء قلیل (الشامیة ٤/٣٥٩، ایچ ایم سعید)

فرق نمبر(٢) : وقف جب اتنے مساکین کے لئے ہو جن کا احصاء ممکن نہ ہو تو اس وقف میں کسی خاص مسکین کا حق نہیں بلکہ متولی کو اختیار ہے جس کو چاہے اور جتنا چاہے دے

٥٠

جبکہ بینک میں شخص قانونی کو یہ اختیار نہیں، البتہ اگر واقف نے مخصوص گنے چنے فقراء کے لئے وقف کیا تو وقف بحکم وصیت ہے اور اس کو وصیت کی طرح نافذ کیا جائے گا۔

قال فی الهندیة : ان کان الوقف علی فقراء قرابته و قریته و هم لا یحصون أو یحصون أو أحد الفریقین یحصون و الآخر لا یحصون ففی الوجه الأول للقیم أن یجعل نصف الغلة لفقراء قرابته و نصفها لفقراء قریته ثم یعطی من کل فریق من شاء منه و یفضل البعض کما یشاء لأن قصده الصدقة و فی الصدقة الحکم کذلک و فی الوجه الثانی یصرف الغلة الی الفریقین بعددهم و لیس له أن یفضل البعض علی البعض لأن قصده الوصیة و فی الوصیة الحکم کذلک و فی الثالث یجعل الغلة بین الفریقین أولا فیصرف الی الذین یحصون بعددهم و الی الذین لا یحصون سهما واحدا ثم یعطی هذا السهم من الذین لا یحصون من شاء و یفضل البعض فی هذا السهم کما بینا و هذا التفریع علی قولهما و أما علی قول محمد فلا یتأتی کذا فی الوجیز .

(الهندیة ٢/٤١٦ ، رشیدیة)

فرق نمبر(٣) : وقف اور بیت المال کے بعض شعبوں کا مقروض و مدیون اور دائن و مقرض ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں وقف اور بیت المال کا چونکہ کوئی حقیقی مالک نہیں جس کی طرف ان امور کی نسبت کی جائے اسی بناء پر ان کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔ جبکہ بینک میں حقیقی ملاک موجود ہیں لہذا حقیقتاً دائن و مدیون وغیرہ یہی ملاک ہیں اور کمپنی کی طرف نسبت صرف مجازاً ہے، جیسا کہ ٹرانسپورٹر گاڑی کی طرف نسبت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ گاڑی مقروض ہوگئی ہے، یا دوکاندار دوکان کی طرف نسبت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دوکان مقروض

ہوگئی ہے۔حالانکہ ان تمام معاملات میں لوگ خود مقروض ہو چکے ہوتے ہیں مگر مجازاً نسبت کرتے ہوئے دوکان وغیرہ کا نام لیتے ہیں۔

قال العلامة الحصكفى رحمه الله تعالىٰ : و على الامام أن يجعل لكل نوع بيتا يخصه و له أن يستقرض من أحدها ليصرفه للآخر و يعطى بقدر الحاجة و الفقه و الفضل فان قصر كان الله عليه حسيبا ، زيلعى

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله : بيتا يخصه) فلا يخلط بعضه ببعض لأن لكل نوع حكما يختص به ، زيلعى (قوله : ليصرفه للآخر) أى لأهله قال الزيلعى رحمه الله تعالىٰ ثم اذا حصل من ذلك النوع شىء رده فى المستقرض منه الا أن يكون المصروف من الصدقات أو من خمس الغنيمة على أهل الخراج و هم فقراء فانه لا يرد فيه شيئا لأنهم مستحقون للصدقات بالفقر و كذا فى غيره اذا صرفه الى المستحق اهـ

(الشامية ۴/۲۱۹ ، ایچ ایم سعید)

﴿علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ امام پر لازم ہے کہ وقف کی ہر قسم کے لئے ایک الگ مد بنائے جو اس کے لئے خاص ہو اس کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ ایک مد سے قرض لے کر دوسرے کے لئے صرف کردے اور لوگوں کو بھی ان کی حاجت ،فقاہت اور فضیلت کے اعتبار سے دیا کرے اگر اس نے اس میں کوتاہی کی تو اللہ تعالیٰ ہی اس سے حساب لیں گے۔

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ الگ الگ مد کی تخصیص کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بعض بعض کے ساتھ خلط نہ ہو اس لئے کہ ہر ایک قسم کا

حکم علیحدہ ہے جو صرف اسی کے ساتھ خاص ہے زیلعی (دوسری مد کے مستحقین پر صرف کرے) علامہ زیلعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں پھر اگر اس دوسری مد میں کچھ آجائے تو جس مد سے قرض اٹھایا ہے اسی میں واپس کردے، ہاں اگر صدقات یا غنیمت کے خمس میں سے اہلِ خراج جو کہ فقراء ہیں، کو دیا گیا ہو تو پھر واپس کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ یہ لوگ اپنے فقر کی وجہ سے صدقات لینے کے مستحق ہیں اور یہی حکم دوسری مد میں بھی ہے بشرطیکہ امام اس کو اس مد کے مستحق کے حوالے کردے﴾

فرق نمبر(۴) :وقف و بیت المال کا نگران متبرع ہوتا ہے جیسے مسجد کا متولی وغیرہ اگر اس کے لئے واقف نے کچھ وقف کیا ہے تو صرف وہی لے گا اور بس، ورنہ عرف و عادت کے مطابق وقف کی جن بعض اشیاء کے استعمال کی اجازت ہوتی ہے ان کو استعمال کرے گا، جبکہ بینک کا نگران بہت بھاری اجرت لیتا ہے اور مقصد کمائی ہی ہوتی ہے۔

قال العلامة ظفر احمد العثمانى رحمه الله تعالىٰ : (قوله : و فيه حديث عمر أنه اشترط فى وقفه أن يأكل من وليه و يؤكل صديقا غير متمول مالا) قال القرطبى : جرت العادة بأن العامل يأكل من ثمرة الوقف حتى لو اشترط الواقف أن العامل لا يأكل منه يستقبح منه ذلك و فى رواية لا جناح على من وليها أن يأكل منها بالمعروف و المراد بالمعروف القدر الذى جرت به العادة،

...... قلت : و هذا اذا لم يعين له الواقف قدرا معلوما فان عين شيئا فهوله و الا فله القدر الذى جرت به العادة (اعلاء السنن ۱۳/ ۱۸۷)

﴿علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں............علامہ قرطبی رحمہ

۵۳

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بات عادت اور تعامل سے ثابت ہے کہ عامل وقف کے پھل سے کھاتا ہے یہاں تک کہ وقف کرنے والے نے (اس عادت و تعامل کے خلاف) یہ شرط لگادی کہ کام کرنے والا اس سے نہیں کھائے گا تو اس کی یہ شرط قبیح سمجھی جاتی ہے، ایک روایت میں ہے کہ وقف کے متولی کے لئے اس میں سے معروف اور اچھے طریقے سے کھانے میں کوئی گناہ نہیں اور المعروف سے مراد اتنی مقدار کھانا ہے جس کی عادت ہو، قلت : یہ اس وقت ہے جب وقف کرنے والے نے کوئی مقدار معین نہ کی ہو اگر کوئی چیز معین کردی تو وہ اس متولی کا ہوگا البتہ جہاں واقف نے کچھ بھی متعین نہیں کیا تو پھر اس کو صرف اتنی مقدار کی اجازت ہوگی جس کی عادت اور تعامل ہے ﴾

ان فروق کا حاصل اور نتیجہ یہ ہے کہ وقف اور بیت المال میں حقیقی مالک نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً ان کی طرف نسبت کی جاتی ہے جبکہ بینک میں حقیقی ملاک ہیں، لہٰذا حقیقۃً دائن و مدیون آخذ و معطی وغیرہ یہی ملاک ہیں اور بینک کی طرف ان امور کی نسبت صرف مجازاً ہے۔

نظیر نمبر (٣) : ترکۃ مستغرقۃ بالدین

یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ احادیث میں ترکہ کو مدیون و مقروض نہیں کہا گیا بلکہ میت کو باعتبار ما کان کے مقروض کہا گیا ہے جیسے ﴿ و أتوا اليتامى أموالهم ﴾ میں بالغ کو باعتبار ما کان کے یتیم کہا گیا۔

عن سلمة بن الأكوع ﷺ : أن النبي ﷺ أتي بجنازة ليصلي عليها فقال : هل عليه من دين ؟ قالوا : لا ، فصلى عليه ، ثم أتي بجنازة

۴

أخرى فقال : هل عليه من دين ؟ قالوا : نعم ، قال : فصلوا على صاحبكم . قال أبو قتادة : على دينه ، يا رسول الله ، فصلى عليه

(البخاری ، باب من تكفل عن ميت ، ١/٣٠٦)

﴿ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ کے پاس جنازہ لایا گیا کہ آپ ﷺ اس پر نماز پڑھیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس پر کوئی قرضہ ہے؟ حاضرین نے جواب دیا: نہیں، پھر آپ ﷺ نے اس کی نماز پڑھائی، پھر ایک دوسرا جنازہ لایا گیا آپ ﷺ نے فرمایا اس پر کوئی قرضہ ہے؟ حاضرین نے عرض کیا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا پھر تم اپنے ساتھی کی نمازِ جنازہ پڑھو، حضرت ابو قتادہ ﷺ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس کا قرضہ میرے ذمہ ہے تب آپ ﷺ نے اس کی نماز پڑھائی ﴾

و عن أبي هريرة ﷺ قال : من ترك مالا فلورثته و من ترك كلا فالينا (البخاری ١/٣٢٣)

﴿ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جس نے مال چھوڑا تو وہ اس کے ورثہ کے لئے ہوگا اور جس نے کوئی بھی نہ چھوڑا اس کے ولی ہم ہیں ﴾

جواب کا حاصل یہ ہے کہ باعتبار ما کان مدیون میت ہی ہے اور شرعاً اس کا اعتبار بھی کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے ترکہ سے پہلے دین ادا ہوگا پھر باقی سے ورثہ کا حق متعلق ہوگا، مقدارِ دین کے ساتھ ورثہ کا حق ہی متعلق نہیں، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میت کو باعتبار ما کان مدیون بھی کہا

گیا ہے اور اس دین کا اعتبار بھی کیا گیا ہے۔

رہی یہ بات کہ استغراق کی صورت میں اس کا دین ورثہ کی طرف منتقل کیوں نہیں ہوتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ شرعاً ورثہ کی طرف وجودی چیزیں منتقل ہوتی ہیں جبکہ دین عدمی چیز ہے۔

نظیر نمبر (۴) :خلطۃ الشیوع

یہ بھی درج ذیل وجوہ کی بناء پر درست نہیں۔

(۱) ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے مال کو شخص نہیں قرار دیا بلکہ خلطہ کی وجہ سے ہر ایک مالک کو مجازاً پورے نصاب کا مالک تصور کیا ہے جیسے شرکتِ ملک میں متون کے مسئلے کے مطابق شریک اجیر چونکہ اپنے عمل کو خلطہ کی وجہ سے خالص اور جدا نہیں کر سکتا اس لئے اجرت کا مستحق بھی نہیں ہوتا، اس لئے اس زکوۃ کا ثواب، اموال اور فرضی شخص کو نہیں ملے گا بلکہ مالکوں کو ملے گا جبکہ شخص قانونی کو مالکوں سے الگ فرض کیا گیا ہے۔

(۲) خلطہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم ﴿ و أتوا الزکوة ﴾ کی وجہ سے اس کا مال مساکین کو کھلایا جاتا ہے عندہم، جبکہ زیر بحث مسئلہ میں شخص قانونی کے اختیارات کسی نص سے ثابت نہیں؟

(۳) یہ حکم احتیاط پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور عبادات میں احتیاط پر عمل واجب ہوجاتا ہے جبکہ زیر بحث مسئلہ میں احتیاط کا پہلو اس کے مقابل ہے، کیونکہ جب شخص قانونی کو مستقل نہ سمجھا جائے گا تو دائنین کے اموال کی حفاظت ہوگی۔

(۴) وجوبِ زکوۃ دیانات اور عبادات کے قبیل سے ہے جبکہ شخص قانونی کی وضع معاملات میں دوسروں کے اموال اور حقوق کو غصب کر کے ہڑپ کرنے کے لئے کی گئی ہے

۶

(۵) ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا اس خلطہ پر اتفاق، شخص قانونی کے تسلیم پر اتفاق کو مستلزم نہیں۔

قال العلامة العینی رحمه الله تعالیٰ: فعلی قول أبی حنیفة رحمه الله تعالیٰ لا یجب علی أحد من الشریکین أو الشرکاء فیما یملک الا مثل الذی کان یجب علیه لو لم یکن خلط، و ذکر فی المبسوط و عامة کتب أصحابنا أن الخلیطین یعتبر لکل واحد نصاب کامل کحال انفراد و لا تأثیر للخلطة فیها سواء کانت شرکة ملک بالارث، و الهبة، و الشراء، و نحوها أو شرکة عقد کالعنان، و المفاوضة ذکره الوبری، و قال ابن المنذر: اختلفوا فی رجلین بینهما ماشیة نصاب واحد قالت الطائفة: لا زکوة علیهما قال: هذا قول مالک و الثوری و أبی ثور و أهل العراق و قال ابن حزم فی (المحلی) : و به قال شریک بن عبدالله و الحسن بن حی و قال الشافعی و اللیث و ابن حنبل و اسحاق تجب علیهما الزکوة و لو کانوا أربعین رجلا لکل واحد شاة تجب علیهم شاة و قال ابن المنذر : الأول أصح یعنی عدم وجوب الزکوة و قال ابن حزم فی المحلی : الخلطة لا تحیل حکم الزکوة و هو الصحیح و قال الطرطوشی : لا تصح الخلطة الا أن یکون لکل واحد منهما نصاب کامل

(عمدة القاری ۶/۴۴۲، بیروت)

’’علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق دو یا دو سے زیادہ شریکوں میں سے ہر ایک پر مملوکہ چیز میں اتنا

ہی واجب ہوگا جتنا کہ خلط ہونے سے پہلے اس پر واجب تھا اور ہمارے اصحاب کی عام کتابوں میں مذکور ہے کہ دو شریکوں میں سے ہر ایک کے لئے کامل نصاب کا اعتبار کیا جائیگا جس طرح بغیر شرکت کے انفرادی حالت میں ہوتا ہے اور اس میں شرکت کا کوئی اثر نہ ہوگا، خواہ وہ شرکت ملک ہو جو وراثت، ھبہ، شراء وغیرہ سے حاصل ہو یا شرکتِ عقد ہو جیسا کہ شرکتِ عنان و مفاوضہ وغیرہ، وبری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ذکر کیا ہے۔
اور ابن المنذر ررحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ دو آدمیوں میں ایک ہی نصاب کے جانور مشترک تھے، ایک جماعت کا تو یہ کہنا ہے کہ ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں اور فرمایا کہ یہ قول امام مالک، ثوری، ابوثور اور اہلِ عراق رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے اور ابن حزم ''المحلی'' میں فرماتے ہیں یہی قول شریک بن عبداللہ اور حسن بن حی کا بھی ہے، اور شافعی، لیث، ابن حنبل اور اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی اگرچہ چالیس آدمی ہوں اور ہر ایک کی ایک ایک بکری ہو تو بھی ان پر ایک بکری واجب ہوگی۔ ابن منذر فرماتے ہیں کہ قولِ اول (یعنی عدمِ وجوبِ زکوٰۃ) اصح ہے، ابن حزم رحمہ اللہ تعالیٰ ''المحلی'' میں فرماتے ہیں کہ خلطہ (شرکت) زکوٰۃ کے حکم کو متغیر نہیں کرسکتا اور یہی صحیح قول ہے، اور طرطوشی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خلطہ (شرکت) اس وقت تک صحیح نہیں جب تک کہ ہر ایک کے لئے ایک نصاب نہ ہو یعنی ہر شریک ایک پورے نصاب کا مالک نہ ہو''

و قال الحافظ رحمه الله تعالىٰ : (قوله : و قال سفيان : لا تجب

حتى يتم لهذا أربعون شاة و لهذا أربعون شاة) قال عبد الرزاق عن الثورى : " قولنا : لا يجب على الخليطين شيء الا أن يتم لهذا أربعون و لهذا أربعون " انتهى و بهذا قال مالك ، و قال الشافعي و أحمد و أصحاب الحديث : اذابلغت ماشيتهما النصاب زكيا (فتح البارى ۳/۴۰۲)

﴿ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مصنف کا یہ قول کہ (سفیان نے کہا ...... زکوٰۃ واجب نہیں یہاں تک کہ دونوں کے لئے چالیس چالیس پورے ہو جائیں) عبدالرزاق، ثوری کے حوالے سے کہتے ہیں ہمارا قول یہ ہے: کہ ''دونوں شریکوں پر کوئی چیز واجب نہیں یہاں تک کہ دونوں کے لئے چالیس چالیس پورے ہو جائیں'' اور ایسی بات امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمائی، شافعی، احمد اور اصحابِ حدیث رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب ان دونوں کی بکریاں نصاب تک پہنچ جائیں تو دونوں زکوٰۃ دیں گے ﴾

و قال في المبسوط : و الاحتياط في العبادة ليؤديها بكمالها واجب (المبسوط ۱۲/۲۱۸)

''مبسوط میں فرمایا: عبادت میں یہ احتیاط ملحوظ رکھنا کہ عبادت کامل طور پر ادا ہو جائے واجب ہے''

و قال المحدث السهارنفورى رحمه الله تعالىٰ : فان لم تبلغ سائمة الرجل من الغنم أربعين فليس فيها شيء واجب من الزكوة الا ان شاء ربها أي مالكها فيتبرع متطوعا .

(بذل المجهود ۳/۱۳)

''محدث سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر کسی آدمی کی بکریاں

۵۹

چالیس تک نہیں پہنچیں تو اس میں کچھ زکوۃ واجب نہیں، ہاں اگر اس کا مالک چاہے تو تبرع کرسکتا ہے''

و قال ملک العلماء الکاسانی رحمه الله تعالیٰ : و قال الشافعی رحمه الله تعالیٰ : اذا کانت أسباب الاسامة متحدة و هو أن یکون الراعی و المرعی و الماء و المراح و الکلب واحدا و الشریکان من أهل وجوب الزکوة علیهما یجعل مالهما کمال واحد و تجب علیهما الزکوة و ان کان کل واحد منهما لو انفرد لا تجب علیه (البدائع ۲/۲۹)

و قال العلامة ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ : الا أن أکثرهم قدموا الزکوة علیه اقتداءً بکتاب الله تعالیٰ و لأنها أفضل العبادات بعد الصلوة ، قهستانی (الشامیة ۳/۲۰۲، رشیدیة)

اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کی تائید کن کو حاصل ہے!

ہمارا دعوی یہ ہے کہ بینک کے کتنے معاملات ایسے ہیں جن میں مجوزین حضرات کی تحقیق اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کے خلاف ہے، اور وہ جمہور علماء جو اسلامی نامی بینکوں کے معاملات کو غیر شرعی سمجھتے ہیں، کی تحقیق اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کے موافق ہے۔

ذیل میں چند نمونے ملاحظہ فرمایئے!

(۱) مرابحہ واجارہ میں عقد سے پہلے وعدہ کو مجوزین حضرات صرف دیانۃً نہیں بلکہ قضاءً بھی لازم فرماتے ہیں اور پورا نہ کرنے کی صورت میں گاہک کو بعض نوعیتوں کے نقصانات کا ضامن اور ذمہ دار بھی قرار دیتے ہیں (غیر سودی بینکاری ۱۵۸، ۱۵۹، ۲۲۴) ....

جبکہ اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کو مفسد عقد اور لازم سمجھنے کو حرام فرمایا ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

سوال (۳۵): عمرو نے زید کو مبلغ سو روپے واسطے خرید نے جفت پاپوش کے دیئے اور کوئی اجرت بطور معاوضہ خریداری کے قرار نہیں پائی متعاقدین میں اجرت کی نسبت ذکر بھی نہیں آیا اور قبل خریداری مال اور دینے زر کی قیمت کے باہمی یہ امر طے ہو چکا تھا کہ یہ مال سوا چھ روپے سیکڑہ کے منافع سے بمیعاد ایک مہینے کے تم کو دے دیں گے مال دساور سے خرید کر زید اپنے گھر لے آیا اور عمرو کو بلا کر مال دکھلا کر جوڑ دیا یعنی شمار کرا دیا اور دونوں نے سمجھ لیا کہ یہ مال مبلغ سو روپے کا ہے اس کے بعد عمرو نے زید سے دریافت کیا کہ تم یہ مال ہم سے کس قدر مدت کے واسطے بشرح منافع مذکورہ بالا لیتے ہو زید نے کہا کہ ایک ماہ کے واسطے لیتا ہوں عمرو نے اس کو قبول کیا، بعد ختم ہونے مدت ایک ماہ کے عمرو نے زید سے اصل روپیہ مع منافع طلب کیا زید نے صرف منافع مبلغ سوا چھ روپے عمرو کو دے کر اصل روپیہ کی نسبت عذر کیا کہ میرے پاس اس وقت موجود نہیں ہے، بلکہ کچھ مال موجود ہے، کچھ نقد ہے اور کچھ ادھار میں ہے، عمرو نے کہا کہ اگر تمہارے پاس زر اصل موجود نہیں ہے تو تم اس کے عوض میں اس قدر کا مال آئندہ کے لئے مجھ کو دے کر اور جوڑ وا کر پھر ہم سے اس کو خرید لو، زید نے مبلغ سو روپے کا مال اپنے پاس دکھلایا اور عمرو کو دے کر جوڑ وا دیا اور پھر بشرح منافع بالا عمرو سے خرید لیا اور مدت کبھی ایک ماہ تراضی طرفین سے قرار پاتی ہے اور کبھی زائد۔

الجواب: یہاں دو بیعیں علی سبیل التعاقب ہیں ایک وہ کہ زید نے عمرو سے

١

مال خریدا اس کا حکم یہ ہے کہ اگر زید عمرو کو اور عمرو زید کو بیع وشراء پر بنا بر وعدہ سابقہ مجبور نہ کرے تو جائز ہے اور اگر مجبور کرے، ناجائز ہے۔ دوسرے بیع وہ جو سو روپیہ بقیہ زر ثمن کے عوض میں زید نے عمرو کو دیا اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس میں یہ شرط ٹھہری کہ پھر عمرو سے زید اس کو خریدے گا تو حرام ہے اور اگر یہ شرط نہ ٹھہری پھر اگر خریدے آزادی سے جدید رائے سے خریدے تو جائز ہے۔ (امداد الفتاوی ٣/٤٠)

نیز ایک اور سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

سوال (٣٤): عمرو نے زید سے کہا تم مجھ کو یک صد روپیہ کا مال جفت پاپوش منگا دو، میں تم سے...... کا منافع دے کر ادھار ایک ماہ کے واسطے خرید کرلوں گا یا جس قدر مدت کے واسطے تم دو گے اسی حساب سے منافع دوں گا یعنی پانچ روپے یک صد روپیہ کا منافع ایک ماہ کے واسطے ہے، جب مال آجاوے گا اس وقت مدت ادھار اور منافع کی متعین ہو جاوے گی۔ اس کے جواب میں زید نے کہا کہ میں منگا دوں گا مگر اطمینان کے واسطے بجائے یک صد کے دو صد کا رقعہ لکھاؤں گا تاکہ تم خلاف عہدی نہ کرو، عمرو نے منظور کیا؟

الجواب: اس میں دو مقام قابل جواب ہیں ایک یہ کہ زید و عمرو میں جو گفتگو ہوئی یہ وعدۂ محضہ ہے کسی کے ذمہ بحکم عقد لازم نہیں اگر زید کے منگانے کے بعد بھی عمرو انکار کردے تو زید کو مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں پس اگر عرف و عادت میں عمرو مجبور سمجھا جاتا ہو تو یہ معاملہ حرام ہے ورنہ حلال الخ (امداد الفتاوی ٣/٤٠)

٢ ٢

اسی طرح حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بیع الوفاء سے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

سوال: کوئی چیز کسی سے اس شرط پر خریدی کہ جب بائع رقم واپس دے گا تو یہ چیز اس کو واپس دے دی جائے گی، کیا یہ معاملہ جائز ہے؟

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر بیع کے اندر یا اس سے پہلے شرط لگائی گئی ہو یا جانبین اس عقد کو غیر لازم سمجھ رہے ہوں تو یہ بیع فاسد ہے اور اگر بیع کے بعد واپسی کا وعدہ کیا تو یہ بیع صحیح ہے اور اس وعدہ کا ایفاء لازم ہے۔

قال فی العلائیة: و قیل بیع یفید الانتفاع به و فی اقالة شرح المجمع عن النهایة و علیه الفتوی، و قیل ان بلفظ البیع لم یکن رهنا ثم ان ذکرا الفسخ فیه او قبله أو زعماه غیر لازم کان بیعا فاسدا و لو بعده علی وجه المیعاد جاز و لزم الوفاء به (رد المحتار ٤/٢٧٤) والله سبحانه و تعالی اعلم (احسن الفتاوی ٦/٥٠٧)

(٢) سودی بینکوں میں کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کو یہ حضرات جائز فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

’’اگر یہ ضرورت نہ ہوتی تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے کو جائز نہ کہا جاتا‘‘ (غیر سودی بینکاری/١٦)

جبکہ اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ اس اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانے کو بھی ناجائز لکھتے ہیں۔

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک سوال کے جواب میں

اسے ناجائز لکھا ہے۔

سوال وجواب دونوں ملاحظہ فرمایئے!

سوال: حفاظت کی غرض سے بینک میں رقم جمع کرانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب باسم ملہم الصواب

بینک میں رقم جمع کرانے تین صورتیں ہیں:

(۱) سودی کھاتہ (سیونگ اکاؤنٹ)

(۲) غیرسودی کھاتہ (کرنٹ اکاؤنٹ)

(۳) لاکر

(الی قولہ رحمہ اللہ تعالیٰ) کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں اگرچہ سود لینے کا گناہ نہیں ہے مگر تعاون علی الاثم کا گناہ اس میں بھی ہے۔

لاکر میں جمع کرانا بھی جائز نہیں، کیونکہ اس میں سود لینے اور تعاون علی الاثم کا گناہ نہیں مگر بینک کے حرام پیسے سے بنے ہوئے خانے کے استعمال کا گناہ ہے، شدید مجبوری کے وقت اس میں رقم جمع کرائی جاسکتی ہے کہ اس میں پہلی دوصورتوں کی نسبت گناہ کم ہے، لیکن پھر بھی استغفار لازم ہے (احسن الفتاوی ۱۴، ۱۵/ ۷)

اَقول! دیکھئے حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے کس صراحت سے اس کو تعاون علی الاثم قرار دے کر اسے ناجائز فرمایا ہے۔

(۳) یک طرفہ وعدہ کو حضرت قضاءً لازم فرماتے ہیں، جبکہ آپ کے والدِ محترم حضرت مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۲ ۴

مگر یکطرفہ وعدہ کو عدالت کے ذریعے جبراً پورا نہیں کرایا جاسکتا ہے، ہاں! بلاعذر شرعی کسی سے وعدہ کرکے جو خلاف ورزی کرے گا وہ شرعاً گناہگار ہوگا، حدیث میں اس کو عملی نفاق قرار دیا گیا ہے

(معارف القرآن ۴۸۰/ ۵، بحوالہ غیرسودی بینکاری صہ ۱۵۷)

اسی طرح حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی ایک فتویٰ ہے۔

سوال: معاہدہ یا وعدہ کی خلاف ورزی گناہ کبیرہ ہے یا صغیرہ؟

الجواب باسم ملہم الصواب

معاہدہ جانبین سے ہوتا ہے، اس کی خلاف ورزی کرنا گناہ کبیرہ ہے، وعدہ جانب واحد سے ہوتا ہے، اس کے خلاف کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وعدہ کرتے وقت ہی ایفاء کی نیت نہ ہو تو گناہ کبیرہ ہے اور اگر ایفاء کی نیت تھی، بعد میں بدل گئی تو بلاعذر خلاف کرنا مکروہ تنزیہی ہے اور عذر کی وجہ سے ہو تو مباح ہے، بشرطیکہ اس سے دوسرے کو ایذاء نہ پہنچے، ایذاء پہنچانا بہرحال حرام ہے۔ (احسن الفتاوی ۳۲/ ۹)

(۴) قسطِ مرابحہ واجارہ میں تاخیر کی صورت میں مجوزین حضرات نے ''لزومِ التزامِ تصدقِ مال'' کا مشورہ دے کر تاخیر کرنے والے پر تصدق کو لازم قرار دیا ہے...... جبکہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس ''لزومِ التزامِ تصدقِ مال'' کے خلاف لکھا ہے۔

سوال وجواب ملاحظہ فرمائیں:

''سوال (۳۸): عمرو اپنے عہد کے موافق ایک ماہ کے بعد زید کو روپیہ نہیں دیتا اور روپیہ جمع کر رکھا ہے اور اس روپیہ سے خود مال لاتا ہے اور فروخت کرتا رہتا ہے منافع اٹھاتا ہے کبھی ڈیڑھ ماہ میں کبھی دو ماہ میں۔ غرض

۵

خلاف عہد زیادہ مدت میں روپیہ اصل مع منافع کے دیتا ہے مگر جس قدر مدت عہد سے زیادہ ہوتی ہے نہ اس کا منافع طلب ہوتا ہے نہ دیا لیا جاتا ہے۔

الجواب: جب زیادہ نہیں لیا جاتا تا زید پر کوئی گناہ نہیں، عمرو پر وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا'' (امداد الفتاویٰ ۴۱،۴۲/۳)

اُقول! حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ''جب زیادہ نہیں لیا جاتا تا زید پر کوئی گناہ نہیں'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ لینے میں گناہ ہے، نیز حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے تصدق کے التزام کے لزوم کا مشورہ بھی نہیں دیا، بلکہ فرمایا کہ وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔

﴿سودی نظام کا متبادل﴾

متبادل کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) شرعی متبادل

(۲) غیر شرعی متبادل

﴿شرعی متبادل﴾ ایسا متبادل جس میں سودی نظام کا بنیادی تصور ذبح کیا گیا ہو اور مضاربہ اور شرکت کی بنیاد پر رقم کا لین دین ہو اور دوسرے تاجروں کی طرح بازاروں میں ان کے پاس مال وسامان تجارت ہو اور ہر خاص وعام کے ذہن میں وضاحت کے ساتھ یہ بات ہو کہ یہ ایک تجارتی ادارہ ہے جس میں جس طرح نفع حاصل ہوتا ہے اسی طرح نقصان بھی ہوسکتا ہے اور نقصان پورا کا پورا ہم ہی کو اٹھانا پڑے گا اور عقود مداینہ کے ساتھ بکثرت عقود نقدیہ بھی ہوں۔ ایسے متبادل کے علماء مکلف بھی ہیں اور اس کا پیش کرنا ضروری بھی ہے اور ایسے ہی متبادل کی حضرت علامہ بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے تمنا فرمائی تھی اور ایسے کو سارے

۶ ۲

علماء ضروری اور حق سمجھتے ہیں۔ (یہ کہنا کہ بینک مخالف علماء کرام دامت برکاتہم شرعی متبادل کے قائل نہیں، بڑی تہمت ہے)

علامہ بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ یہ ہیں: ''بینک کا رائج نظام **بغیر ''ربوا''** چل نہیں سکتا، اس لئے آپ کو بینک کے **متبادل نظام مضاربت، وکالت اور شرکت** پر غور کرنا ہوگا جو بلاسود کے چل سکے اور جس سے جدید معاشرے کے مسائل اور مشکلات حل ہوسکیں الخ (بینات بحوالہ غیر سودی بینکاری صفحہ ۱۶،۱۷)

جلی الفاظ پر غور کیجیے، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے مضاربہ، وکالہ اور شرکت کے نظام کو متبادل فرمایا ہے جس میں نفع ونقصان دونوں کا تصور عادۃً لازم ہے جبکہ موجودہ اسلامی نامی بینکوں کے خاکے اور ڈھانچے میں عادۃً نقصان کا تصور ہی نہیں، جیسے سودی بینکوں کے خاکے میں نہیں ہوتا، لہٰذا حضرت علامہ بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے جامعہ کے رفقائے افتاء اور دوسرے وہ تمام علماء جو موجودہ اسلامی نامی بینکوں کے مخالف ہیں سب اس متبادل کے قائل ہیں اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں اور موجودہ اسلامی بینکاری نظام کو غیر شرعی متبادل سمجھنے کی وجہ سے مخالف ہیں۔ کیونکہ اصلی مضاربت اور شرکت میں مضارب اور شریک کا زیادہ تر نفع کا مدار عقود نقدیہ پر ہوتا ہے نہ کہ مداینت پر، اور مداینت بھی ایسا جس کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں، کیونکہ مجوزین حضرات نے اس کا پورا ڈھانچہ مرجوح، ضعیف اور غیر معمول بہا اقوال پر قائم فرمایا ہے، جس کی تفصیل گزر گئی، اور شاید کسی کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا۔

اگر کوئی مسلمان تاجر شرعی متبادل پر سو فیصد عمل کرنے کی ہمت رکھتا ہے، تو تشریف لائیے، مجوزین کے ہاں شرعی متبادل حاضر ہے۔

﴿غیر شرعی متبادل﴾ ایسا متبادل جس میں سودی نظام کے بنیادی تصور (جو ''خرما

۲ ۷

ہی خرما ہے اور ثواب برائے نام' اور زر کے عوض زر اور نفع ہی نفع کے حصول پر مشتمل ہے اور جس میں نقصان کا عادۃً تصور ہی نہیں ہے) کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

چونکہ ایسے متبادل میں پورے طور پر اسلامی اصول پر عمل کرنا مشکل بلکہ ناممکن کے درجہ میں ہے اس لئے ایسے متبادل کے نہ ہم مکلّف ہیں اور نہ ہی ایسا متبادل جائز ہے۔ (اس وقت اسلامی نامی بینک ایسے ہی متبادل ہیں، اس لئے علماء کی جمِ غفیر نے اس کو رد کر دیا ہے)

خود حضرت مفتی صاحب مدظلہ لکھتے ہیں:

''البتہ جیسا کہ میں نے ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' میں پوری وضاحت کے ساتھ عرض کیا ہے، ہم ہر اس کام کا متبادل پیش کرنے کے مکلّف نہیں ہیں جو سودی بینک انجام دیتے ہیں، مثلاً قرضوں کی خرید و فروخت، مشتقات (derivatives) مستقبلیات (futures) وغیرہ وغیرہ۔ وہاں میں نے عرض کیا ہے کہ: (۱)..................

''(۲) چونکہ سود کی ممانعت کا اثر تقسیم دولت کے پورے نظام پر پڑتا ہے، اس لئے **یہ توقع کرنا** بھی غلط ہوگا کہ سود کے **شرعی متبادل** کو برسرِ کار لانے سے تمام متعلقہ فریقوں کے **نفع کا تناسب** وہی رہے گا جو اس وقت سودی نظام میں پایا جاتا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلامی احکام کو ٹھیک ٹھیک روبہ کار لایا جائے تو اسی تناسب میں **بڑی بنیادی تبدیلیاں** آسکتی ہیں بلکہ **یہ تبدیلیاں ایک مثالی اسلامی معیشت کے لئے ناگزیر طور پر مطلوب** ہیں (غیر سودی بینکاری/۱۸)

اَقول! درج ذیل وجوہ کی بناء پر آج کے اسلامی نامی بینک شرعی متبادل نہیں۔

۲ ۸

اولاً: جلی جملوں کو بار بار پڑھیے، پھر موجودہ اسلامی بینکوں کو دیکھئے اور فیصلہ کیجیے...... کیا نفع کے تناسب میں کوئی بنیادی فرق ہے؟ کیا بنیادی تبدیلیاں آچکی ہیں؟ اس کا فیصلہ خود حضرت کی درج ذیل عبارت میں ملاحظہ فرمائیے۔

تحریر فرمایا ہے:

''اس سلسلے میں بندے نے اپنی کتاب میں مندرجہ ذیل گفتگو کی ہے: اس میں کوئی شک نہیں کہ حلال منافع کے تعین کے لئے سود کی شرح کا استعمال پسندیدہ نہیں اور اس سے یہ معاملہ کم از کم ظاہری طور پر سودی قرضے کے مشابہ بن جاتا ہے اور سود کی شدید حرمت کے پیش نظر اس ظاہری مشابہت سے بھی جہاں تک ہو سکے بچنا چاہئے''

(اسلامی بینکاری کی بنیادیں، بحوالہ غیر سودی بینکاری ۲۶۸)

معلوم ہوا کہ نفع میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں، بلکہ ابھی تک وہی سود کی شرح استعمال ہو رہی ہے۔

ثانیاً: جس طرح سودی بینکوں کے کوئی شوروم اور مال تجارت کے گودام وغیرہ نہیں ہوتے اسی طرح اسلامی نامی بینکوں کے بھی نہیں ہیں، دونوں قسم کی بینکوں میں جائیے آپ کو کرنسی ہی کرنسی گھومتی ہوئی نظر آئے گی، البتہ یہاں درمیان میں مرابحہ اور اجارہ کا حیلہ ہے وہاں بغیر حیلہ کے ہے...... اور حیلہ مرابحہ و اجارہ میں چونکہ بینک کا کسی قسم کا نقصان نہیں ہے، صرف گاہک ہی کو زحمت اٹھانی پڑتی ہے کہ وہ خریداری بھی خود کرے پھر بینک کے پاس کاغذات لے جانے اور لانے کی مشقت بھی اٹھائے اور بینک کے ہاں صرف نقد کرنسی ہی جمع کرتا ہے، بہر حال نتیجہ کے لحاظ سے دونوں میں نقود ہی گھومتی رہتی ہیں اور بس۔

٩

ثالثاً: آج تک ہمیں تو کوئی ایسا گاہک نہیں ملا جس نے کہا ہو کہ میزان وغیرہ بینکوں میں مضاربت یا تجارت پر رقم لگاتا ہوں، ہاں! ایسے کئی ملے ہیں جنہوں نے بتلایا کہ سودی بینک زیادہ نفع دیتا ہے مثلاً لاکھ پر تیرہ سو روپیہ دیتا ہے اور میزان وغیرہ اسلامی بینک کم نفع دیتا ہے مثلاً آٹھ سو روپیہ دیتا ہے، یعنی اسلامی بینک دوسرے سودی بینکوں سے بھی عوام کا خون زیادہ چوستے ہیں۔

رابعاً: اگر حضرت مدظلہ واقعی فرق اکاؤنٹ ہولڈر کے ذہن میں ڈالنا چاہتے ہیں تو دو کام بینک سے کروالیا جائے۔

پہلا کام: صرف ایک صفحہ اردو زبان میں تحریر کروائیں جس میں مضاربت سے متعلق چند ضروری امور نمبروار واضح طور پر لکھے ہوں۔

مثلاً: (١) رقم جمع کرنے والا رب المال ہے اور بینک مضارب ہے یعنی کام کرنے والا۔

(٢) نفع اس نسبت سے تقسیم ہوگا مثلاً ٨٠ فیصد بینک لے گا اور ٢٠ فیصد رب المال۔

(٣) اگر نقصان ہوا تو وہ اولاً نفع سے پورا کیا جائے گا جو اس سے بڑھ جائے تو وہ بینک کے ذمہ نہ ہوگا بلکہ سارا کا سارا رقم جمع کرنے والے پر ہوگا۔

دوسرا کام: اس تحریر پر دستخط کے وقت زبانی یہ وعدہ نہ کریں کہ یہ صرف مسئلہ کو درست کرنے اور جائز و مسلمان بنانے کے لئے لکھا گیا ہے، واقعۃً ایسا نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ کو نفع ہی ملتا رہے گا اور کبھی نقصان ہوا بھی تو بھی وہ دوسروں کا ہوگا، آپ کا نہ ہوگا، ہم ہدیہ وغیرہ کے نام سے آپ کو تخمینی طے شدہ نفع دیتے ہی رہیں گے۔............ کیونکہ اس زبانی وعدہ سے تحریر سابق کی حیثیت ختم ہوجائے گی اور زبانی معاملہ اصل بن جائے گا جبکہ

٧٠

اس طرح معاملہ ناجائز اور خلافِ شرع ہے۔ یہ دو کام کروادیں لیکن...... مشکل ہے کہ بینک ان دونوں کاموں کے لئے آمادہ ہوجائیں۔

خامساً: تحریر فرماتے ہیں:

> ''(٣) آج کل بینک جو خدمات انجام دیتا ہے (الی قولہ) لیکن ان بچتوں کو صنعت وتجارت میں مصروف کرنے کے لئے جو راستہ مروجہ بینکوں نے اختیار کیا ہے، وہ قرض کا راستہ ہے، چنانچہ یہ ادارے سرمایہ داروں کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ دوسروں کے مالی وسائل کو اپنے منافع کے لئے اس طرح استعمال کریں کہ **ان وسائل سے پیدا ہونے والی دولت کا زیادہ حصہ خود ان کے پاس رہے، اور سرمایہ کے اصل مالکوں کو ابھرنے کا کماحقہ موقع نہ مل سکے''**
>
> (اسلام اور جدید معیشت وتجارت، بحوالہ غیر سودی بینکاری/١٩)

اَقول! جو حال حضرت نے مروجہ بینکوں کا (اوپر جلی الفاظ میں) لکھا ہے اس سے بدتر حال آنجناب کے ادارے کے بہت بڑے مفتی حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب زید مجدہم نے ان اسلامی نامی بینکوں کا لکھا ہے۔

> فرماتے ہیں: ''اگر کوئی شخص مجھ سے ذاتی طور پر دریافت کرتا ہے کہ میں اسلامی بینکوں سے مالی معاملہ کروں یا نہ کروں؟ تو میں اس سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا وہ سودی بینکوں سے معاملات کرتا ہے یا نہیں؟
>
> (الف) ...... اگر وہ یہ بتاتا ہے کہ میں نے سودی بینکوں سے کبھی کوئی معاملہ نہیں کیا اور میں اس کے بغیر بھی کام چلا سکتا ہوں تو میں اسے یہی کہتا

ہوں کہ وہ **غیرسودی بینکوں سے بھی دور رہے** اوران سے معاملہ نہ کرے۔

وجہ یہ ہے کہ اول تو غیر سودی بینکوں میں بھی **تمویل کے جتنے معاہدے ہوتے ہیں وہ بہرصورت مداینت پیدا کرتے ہیں جوقوی ضرورت کے بغیر اختیار کرنا اچھانہیں۔**

دوسرے یہ کوئی **عوامی فلاح کے ادارے نہیں ہیں** جن کے پیش نظر عوامی فلاح ہو، یہ خالص تجارتی ادارے ہیں۔ ان کے **مالکان اور ذمہ داران میں سے ایک تعداد اُن لوگوں کی بھی ہے جن کی نشو ونما سرمایہ داری پرمبنی سودی بینکاری کے ماحول میں ہوئی** اور وہ اسلامی نظام عدل سے کما حقہ واقف نہیں، تجارتی ادارے ہونے کی بناء پران کا مقصد منافع حاصل کرنا ہے اور **اپنی ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی، غیر معمولی تنخواہوں اور دیگر غیر معمولی سہولیات کو تحفظ دینا ہے اور بسا اوقات خواہ جائز عقود ہی کے ذریعے یہ عوام کے روپے سے ان کونفع تو کالعدم دیتے ہیں اپنے نفع کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔**

تاہم ان میں سے جو بینک مستند اور محتاط علماء کرام کی نگرانی میں چل رہے ہوں انکی مذکورہ بالا کوتاہیوں کے باوجوداتنی بات قابل تحسین ہے کہ انہوں نے عوام اورتاجروں کوحرام سے بچنے کا موقع فراہم کردیا ہے، اور جولوگ اپنی تجارت یا اپنے روپے کی حفاظت کے لئے بینکوں سے معاملہ کرنے پر مجبور ہیں ان کے لئے سود کے حرام معاملات میں پھنسنے کے بجائے ان غیر سودی بنکوں کے ذریعے حرام سے بچنے کا ایک راستہ نکال کر علماء کرام نے ایک قابل قدر اور قابل ستائش کوشش کی ہے............ لیکن ان کو اسلامی بینک کہنے کی ہمت نہیں ہوتی، کہیں سبقت قلم سے لکھ دیا ہو یا شہرت کی بناء

پر کہہ دیا جاتا ہوتو اور بات ہے۔ بہرحال انہوں نے اسلامی بینکاری کا مثالی نمونہ ابھی تک پیش نہیں کیا'' (جواب تحریر حضرت مولانا عبدالرحمٰن کوثر صاحب مدینہ منورہ والے صہ۲)

اُقول! حضرت مفتی محمود اشرف صاحب زیدمجدہم کی پوری عبارت خصوصاً جلی جملوں پر بار بار نظر ڈالیئے اور فیصلہ کیجیے کہ جن بینکوں کے دفاع میں لمبی چوڑی ضخیم جلدوں کی کتابیں لکھی جارہی ہیں ان کے مقاصد اور مروجہ بینکوں کے مقاصد میں سرِ موبھی فرق نہیں، دونوں عوام کوکُند چھری سے ذبح کرنے پر کمربستہ ہیں بلکہ یہ اسلامی نامی بینک اس کارِخیر میں چند قدم آگے ہی ہیں۔

سادساً: غیرسودی بینکاری صفحہ ۱۹ پر تحریر فرماتے ہیں:

''چنانچہ مروجہ نظام بینکاری میں بینک کی حیثیت محض ایک ایسے ادارے کی ہے جو روپے کا لین دین کرتا ہے، اسے اس بات سے سروکار نہیں ہے کہ اس روپے سے جو کاروبار ہورہا ہے اس کا منافع کتنا ہے؟ اوراس سے کس کوفائدہ اور کس کونقصان پہنچ رہا ہے؟

اسلامی احکام کی رُو سے بینک ایسے ادارے کی حیثیت میں باقی نہیں رہ سکتا جس کا کام صرف روپے کا لین دین ہو۔ اس کے بجائے اسے ایک ایسا تجارتی ادارہ بنانا پڑے گا جو بہت سے لوگوں کی بچتوں کو اکھٹا کر کے ان کو براہ راست کاروبار میں لگائے، اور وہ سارے لوگ جن کی بچتیں اس نے جمع کی ہیں، براہ راست اس کاروبار میں حصہ دار بنیں، اور ان کا نفع و نقصان اس کاروبار کے نفع ونقصان سے وابستہ ہو جوان کے سرمایہ سے

بالآخرانجام دیا جارہا ہے۔ **لہٰذا سودی بینکاری کے متبادل جو نظام تجویز کیا جائیگا،** اس پر یہ اعتراض نہ ہونا چاہئے کہ بینک نے اپنی سابقہ حیثیت ختم کردی ہے اور **وہ بذات خود ایک تجارتی ادارہ** بن گیا ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ ضرورت پوری نہیں ہوسکتی جس کی وجہ سے **متبادل نظام** کی تلاش کی جارہی ہے۔'' (اسلام اور جدید معیشت وتجارت، بحوالہ غیرسودی بینکاری صہ ۱۹، ۲۰)

اُقول! مذکورہ عبارت، خصوصاً جلی جملوں پر غور کیجیے جن سے صاف واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ متبادل اس وقت درست ہوسکتا ہے کہ جب بینک اپنی سابقہ حیثیت ختم کردے اور عام تاجروں کی طرح مضاربت اور شرکت کے تحت اکثر عقود نقدیہ اور کچھ عقود مداینہ سے کام چلائے، اور مارکیٹوں میں سامانِ تجارت رکھیں اور شوروم بنائیں۔

﴿مرابحہ واجارہ، اصل تجارت یا حیلہ!﴾

بندہ کو اس سلسلہ میں دو اشکال تھے، جو بحمد اللہ تعالیٰ حضرت زید مجدہم کی کتاب ''غیرسودی بینکاری'' کے مطالعہ سے حل ہوگئے۔

اشکال نمبر ۱: حضرت مدظلہ کا مختلف مجالس میں اس پر زور دینا کہ بینکوں کو مرابحہ اور اجارہ پر قناعت نہیں کرنا چاہیئے بلکہ مضاربت اور شرکت کی طرف بڑھنا چاہیئے۔

حضرت کے اس ارشاد سے بندہ کو دو طرح اشکال تھا، ایک یہ کہ بینک جس سے رقم لیتا ہے، مضاربہ اور شرکت ہی پر لیتا ہے، تو مضاربہ اور شرکت کی طرف بڑھنے کا کیا معنی؟ دوسرے یہ کہ اور مضاربین وشرکاء بھی تو بازاروں میں مرابحہ وغیرہ ہی کی صورت میں تجارت کرتے ہیں تو اگر بینک بھی یہی کرے تو کونسا کمال کیا؟ اس میں بینک کی کوئی نمایاں اور امتیازی کارکردگی نہیں۔

اشکال نمبر ۲: بنوری ٹاؤن سے شائع ہونے والی کتاب میں مرابحہ واجارہ بنوکیہ کو محض (سود کھانے کا) ایک حیلہ بتایا گیا ہے۔

بندہ کو اس عبارت میں یہ اشکال تھا کہ مرابحہ اور اجارہ تو عام تاجر بھی کرتے ہیں اور یہ مال کمانے کے ذرائع ہیں، پھر ان کو حیلہ کیوں کہا گیا ہے؟ کتاب ''غیرسودی بینکاری'' کے مطالعہ سے بحمد اللہ تعالیٰ دونوں اشکال ختم ہوگئے کیونکہ حقیقت سامنے آگئی۔

﴿اصل حقیقت کیا ہے؟ رفع اشکالات کیونکر؟ اور ہمارے تحفظات کیا ہیں؟﴾

رفع اشکال نمبر ۱: اس کتاب سے حضرت کے ارشاد کی اصل حقیقت معلوم ہوئی کہ مرابحہ اور اجارہ بھی تجارت ہی کی ایک قسم ہے لیکن اس میں منافع کم حاصل ہوتے ہیں، اگر بینک لوگوں سے مضاربہ یا شرکت کے طور پر لی ہوئی رقوم کو آگے مضاربہ یا شرکت پر کسی کارخانے یا فیکٹری میں لگاتے تو نفع بہت زیادہ آتا جس کی وجہ سے رقم جمع کرانے والے تمام افراد کو زیادہ سے زیادہ نفع مل جاتا۔ گویا عوام کو زیادہ نفع دلانے کی خاطر یہ مشورہ دیا جارہا ہے کہ مرابحہ واجارہ کے بجائے آگے مضاربہ یا شرکت پر رقم لگاؤ تاکہ عوام الناس کو زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو اور بینک کی ایک نمایاں کارکردگی بھی سامنے آئے۔

رفع اشکال نمبر ۲: علامہ بنوری ٹاؤن سے شائع ہونے والی کتاب کی عبارت کا مقصد یہ ہے کہ وہ حضرات فرماتے ہیں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ بینک کو نہ مرابحہ سے سروکار ہے اور نہ ہی اجارہ سے۔ بینک کو تو نقد رقم کے عوض دوسرے بینکوں کی طرح سود درکار ہے اس سود کے حاصل کرنے کے لئے یہ مجبوراً مرابحہ اور اجارہ کا سہارا لیتے ہیں، گویا بینک مرابحہ و

۷۵

اجارہ بطور تجارت کے نہیں کرتا بلکہ سود کھانے کے لئے بطور حیلہ کے مجبوراً کرتا ہیں۔ لہٰذا مرابحہ واجارہ بنوکیہ کو عام تجارتی مرابحات واجارات پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ کیونکہ بازاروں میں دوسرے تاجر جو مرابحہ واجارہ کرتے ہیں، تجارت سمجھ کر کرتے ہیں جبکہ مرابحہ بنوکیہ اور اجارہ بنوکیہ ایسا نہیں۔

ہمارے تحفظات!

(۱) سودی بینکوں کا جو تشخص ہے مجوزین حضرات نے اسلامی نامی بینکوں میں اسی کو برقرار رکھنے کی انتھک کوشش فرمائی ہے، حتی کہ اس کو برقرار رکھنے کے لئے مرجوح اقوال پر عمل اور خروج عن المذہب بلکہ خروج عن المذاہب الاربعہ جیسے امور سے بھی دریغ نہیں فرمایا۔

(۲) بینک کا تشخص کیا ہے؟....زر سے زر کمانا....اور....اس طور پر نفع ہی نفع حاصل کرنا جس میں نقصان کا عادۃً تصور ہی نہ ہو۔

حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب زید مجدہم تحریر فرماتے ہیں:

''یہ (بینک) کوئی عوامی فلاح کے ادارے نہیں ہیں جن کے پیش نظر عوامی فلاح ہو، یہ خالص تجارتی ادارے ہیں ان کے مالکان و ذمہ داران میں سے ایک تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جن کی نشو ونما سرمایہ داری پر مبنی سودی بینکاری کے ماحول میں ہوئی ہے اور وہ اسلامی نظام عدل سے کما حقہ واقف نہیں۔ تجارتی ادارے ہونے کی بناء پر ان کا مقصد منافع حاصل کرنا ہے اور اپنی ٹھاٹ باٹھ کی زندگی غیر معمولی تنخواہوں اور دیگر غیر معمولی سہولیات کو ''تحفظ دینا ہے'' اور بسا اوقات خواہ جائز عقود ہی کے ذریعے یہ عوام کے روپے سے ان کو نفع تو کالعدم دیتے ہیں اپنے نفع کا خاص اہتمام

کرتے ہیں۔

تاہم ان میں سے جو بنک مستند اور محتاط علماء کرام کی نگرانی میں چل رہے ہوں انکی مذکورہ بالا کوتاہیوں کے باوجود اتنی بات قابل تحسین ہے کہ انہوں نے عوام اور تاجروں کو حرام سے بچنے کا موقع فراہم کردیا ہے، اور جو لوگ اپنی تجارت یا اپنے روپے کی حفاظت کے لئے بنکوں سے معاملہ کرنے پر مجبور ہیں ان کے لئے سود کے حرام معاملات میں پھنسنے کے بجائے ان غیر سودی بنکوں کے ذریعے حرام سے بچنے کا ایک راستہ نکال کر علماء کرام نے ایک قابل قدر اور قابل ستائش کوشش کی ہے.......... لیکن ان کو اسلامی بینک کہنے کی ہمت نہیں ہوتی، کہیں سبقت قلم سے لکھ دیا ہو یا شہرت کی بناء پر کہہ دیا جاتا ہو تو اور بات ہے۔ بہر حال انہوں نے اسلامی بینکاری کا مثالی نمونہ ابھی تک پیش نہیں کیا'' (جواب تحریر مولانا کوثر صاحب مدینہ طیبہ والے، صہ۲)

(۳) اگر مجوزین حضرات بینک کے اس تشخص کا انکار کرتے ہیں تو ہم ''چھوٹا منہ بڑی بات'' انتہائی ادب سے عرض کرتے ہیں کہ اس تشخص کا انکار بداہت کا انکار ہے۔

بینک کے مالکان اُس وقت تک آپ کے تشکیل دیئے ہوئے نظام کو ماننے کے لئے تیار ہیں جب تک معاملہ ''ہم خرما ہم ثواب'' تک محدود ہے۔ اور بقول حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب زید مجدہم ان کا اصل مقصد ''خرما'' ہی ہے۔ چونکہ آپ کے تشکیل دیئے ہوئے نظام سے ان کے ''خرما'' کا کوئی نقصان نہیں بلکہ آپ کے نظام نے ہر لحاظ سے اُس کے خرما کو تحفظ دیا ہے اس لئے آپ مدظلہ کو وہ بڑا بنائے ہوئے ہیں اور آپ کے نظام کو قبول کئے ہوئے ہیں۔

۷۷

مجوزین حضرات کا ہر وہ مشورہ اور نظام جس سے ان کے ''خرما'' پر زد پڑتی ہو، کو یہ ہرگز ہرگز نہ قبول کرتے ہیں اور نہ قبول کریں گے۔ اس لئے اس دعوی میں بینک کے مخالف علمائے کرام دامت برکاتہم حق بجانب ہیں کہ مجوزین حضرات ہر مجلس میں اور ہر تحریر میں بینکوں کو مضاربہ اور شرکت کا مشورہ دیتے رہیں، قیامت آجائے گی، یہ کبھی بھی اس موجودہ تشخص کے ساتھ مضاربہ یا شرکت کی بنیاد پر تجارت نہیں کریں گے۔ کیونکہ اس صورت میں ان کے ''خرما'' کو ''بیمہ'' جس کا نام ''تکافل'' رکھا ہے، کے ذریعہ تحفظ دینے کے باوجود، عادۃً کئی ایسے معتد بہا نقصانات درپیش ہیں جن سے بچنا ممکن نہیں۔

(ہاں! مرابحہ اور اجارہ کی طرح اگر مرجوح اور ضعیف اقوال کے سہارے سے مضاربہ و شرکت کی اصل صورت مسخ کر کے ان کو کوئی جدید ایسی صورت دی جائے جس سے ان کے ''خرما'' پر زد نہ پڑے اور نقصان کا معتد بہ تصور ختم ہو جائے تو پھر بینک اس کے لئے بھی تیار ہو جائے گا)

نقصان کے معتد بہ تصور کی وجہ سے بینک کا مضاربت و شرکت پر نہ آنا اور اس سلسلے میں حضرات مجوزین کے مشوروں پر عمل نہ کرنا اس کی واضح دلیل ہے کہ یہ کسی طرح بھی بینک کے تشخص اور ''خرما'' کے خلاف کرنے کو تیار نہیں۔

اس بات کو (کہ میزان بینک وغیرہ کا تشخص بھی نفع ہی نفع اور ''خرما ہی خرما'' ہے، اسلام کا نام صرف تحفظ کے لئے ہے ثواب کے لئے نہیں) اور زیادہ وضاحت اور آسانی سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ہم مجوزین حضرات کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ بینک کے علاوہ کتنے ہی تاجر ہیں جن کے ہاں شورومز، گودام اور مارکیٹوں میں مال موجود ہوتا ہے اور بوقت مرابحہ و اجارہ ان کو مرجوح، ضعیف اور خارج عن المذہب اقوال کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی......اگر میزان بینک وغیرہ زر کے بدلے زر اور نفع ہی نفع کی پالیسی اور تشخص پر

۷۸

قائم نہیں بلکہ ایک تجارتی تشخص جس میں نفع اور نقصان دونوں کا مساوی یا نفع کا راجح اور نقصان کا مرجوح تصور لے کر قائم ہوئے ہیں تو آپ حضرات ان کے مالکان کو اس پر تیار کریں کہ وہ دوسرے تاجروں کی طرح مال تجارت گاہک آنے سے پہلے خریدیں اور شوروم، گودام اور مارکیٹ بنائیں تاکہ المواعید قد تکون لازمة، قد برائے تقلیل کو تکثیر بلکہ عموم کے لئے لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ اور راجح قول کہ وعدہ قبل عقد البیع و فی صلب العقد دونوں مفسد بیع ہیں، کا ترک لازم نہ آئے۔

لیکن یہ حضرات کتنا ہی اس پر زور لگا دیں، نہ بینک شوروم کھولے گا اور نہ ہی دوسرے اموال پہلے سے خریدے گا (حالانکہ سالوں کے تجربہ سے بینک جانتا ہے کہ ہم سے لوگ مرابحۃً کونسا سامان خریدتے ہیں اور اجارۃً کونسا لیتے ہیں) یہ حضرات بینک سے یہ کام کیوں نہیں کروا سکتے؟............اس لئے کہ اس میں بینک کے تشخص اور ''خرما'' کے نقصان کا قوی اور عادۃً تصور موجود ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہمارے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ جس تشخص کا بینک قائم کرنا چاہتے تھے، موجودہ میزان وغیرہ بینکیں اس تشخص کے حامل نہیں لہٰذا نہ تو ان کو اسلامی بینک کہا جا سکتا ہے اور نہ سود وغیرہ امور غیر شرعیہ سے پاک کہا جا سکتا ہے۔

الحمدللہ تعالیٰ اتنی بات تو خود دارالعلوم کے بڑے مفتی حضرت مفتی محمود اشرف صاحب زید مجدہم نے بھی تسلیم فرمائی ہے کہ یہ اسلامی نہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''لیکن ان کو اسلامی بینک کہنے کی ہمت نہیں ہوتی، کہیں سبقت قلم سے لکھ دیا ہو یا شہرت کی بناء پر کہہ دیا جاتا ہو تو اور بات ہے۔ بہرحال انہوں نے اسلامی بینکاری کا مثالی نمونہ ابھی تک پیش نہیں کیا'' (جواب تحریر حضرت مولانا عبدالرحمٰن کوثر صاحب مدینہ منورہ والے ص۲)

۷۹

﴿بینکنگ کے مسئلہ پر اجتماعی غور وفکر کی کوشش ناکام کیوں ہوئی؟﴾

جس مجلس میں ملک کے مختلف اطراف سے آنے والے مفتیان کرام متفقہ فتویٰ دے رہے تھے، اس مجلس میں بندہ خود بھی موجود تھا۔ اس مجلس میں یہ بات بھی زیرِ غور آئی کہ فتویٰ دینے سے قبل مجوزین حضرات خصوصاً دارالعلوم کراچی کے مفتیان کرام جن کا کردار کم از کم پاکستان کی حد تک بنیادی ہے، اُن کو بھی بلایا جائے یا نہیں؟ اہل مجلس نے اتفاق رائے سے ان کے ساتھ اس مسئلے پر بات کرنے کو قطعاً غیر مفید قرار دیا اور وجہ جو بتلائی گئی وہ یہ تھی کہ اُن سے بحث ومباحثہ میں کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اجتماعی غور سے اُن کا مقصد ایسے مسائل میں اغلب یہ ہوتا ہے کہ خلاف کو اختلاف بنادیا جائے، یہی وجہ ہے کہ غور وفکر اور بحث ومباحثہ کے بعد اُن کے فیصلے اکثر اصول کے خلاف ہوتے ہیں۔

علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اجتماعی مسائل میں غور اور بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ کرنے کے جو اصول تحریر فرمائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اجتماعی مسائل میں غور وفکر کرنے کے بعد اکثریت کی رائے عوام کو بتلادی جائے، اور کسی کی انفرادی رائے ہو تو وہ اپنی ذات کی حد تک رکھے، عوام کے سامنے اس کا اظہار نہ کرے تاکہ عوام میں انتشار اور افتراق کا سبب نہ بنے۔

حضرت علامہ بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ یہ ہیں: ''شورائی اجتہاد کا اہتمام ہو، شخصی رائے کی کمی کو اجتماعی آراء سے پورا کیا جائے، حضور ﷺ نے جدید مسائل میں انفرادی رائے کی بجائے فقہاء وعابدین سے مشاورت کا حکم دیا ہے، ادھر امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی فقہی مجلس بھی اسی کا مصداق ومظہر تھی باوجود یہ کہ اس میں ہر فرد یکتائے زمانہ تھا''...... ایک اور مقام پر فرمایا: ''اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ مزایا اور خصوصیات جو فراواں علم، عظیم اخلاص اور شدتِ خشیت اللہ کے ساتھ ہمارے سلفِ صالحین کے اندر موجود تھیں اس دور میں کسی بڑی

۸۰

سے بڑی شخصیت میں بھی جمع نہیں ہوسکتیں لہٰذا اس کی تلافی اس طرح کی جائے کہ جہاں تک ہو کسی ایک فرد کی شخصی رائے پر اعتماد اور اس کو قبول کرنے سے اجتناب کیا جائے خواہ وہ کتنا ہی وسیع النظر اور کثیر المعلومات عالم کیوں نہ ہو، بلکہ اس ذمہ داری کا بار اٹھانے کے لئے ایک جماعت سامنے آئے جس میں بحیثیت مجموعی وہ تمام ممیزات وخصائص موجود ہوں جن کا تذکرہ کیا جاچکا'' (مروجہ اسلامی بینکاری ۳۰)

بندے نے اس وقت ان اکابر زید مجدہم پر اعتماد کرتے ہوئے اُن کی ان باتوں کی جو اپنے تجربات کی بنیاد پر فرمارہے تھے (خصوصاً بنوری ٹاؤن وجامعہ فاروقیہ کے مفتیانِ کرام زید مجدہم جو دارالعلوم کی تقریباً ہر مجلسِ تحقیق میں شریک ہوتے رہے) حمایت کی۔

لیکن بندہ کی چونکہ ہمیشہ کے لئے اپنی بساط کے مطابق کوشش رہی ہے کہ علماءِ حق کے مابین اختلاف بالکل نہ رہے یا قلیل سے قلیل تر رہے، اس لئے اس کوشش کا آغاز کرتے ہوئے ''غیر سودی بینکاری'' نامی کتاب کی تصنیف اور طباعت سے قبل چند احباب سمیت دارالعلوم حاضر ہوا، اگرچہ اس سے قبل ایک مشاہدہ منیٰ کے مسئلے کے عنوان سے میرے سامنے آچکا تھا کہ واقعی دارالعلوم کے مفتیانِ کرام اپنی رائے کو اکثریت کی مخالفت کے باوجود حتی الامکان چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

مسئلۂ منیٰ کی مختصر روئیداد یہ ہے کہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے احباب نے ملک بھر کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے دارالافتاء سے اور بعض غیر ممالک سے بھی اربابِ افتاء کو مدعو کرتے ہوئے تین روزہ اجتماع رکھا اور بلاشبہ انھوں نے لاکھوں کے اخراجات کئے۔

اس اجتماع میں اکثریت کی رائے یہی تھی کہ منیٰ اور مکہ مکرمہ الگ الگ مواضع ہیں لیکن پھر بھی دارالعلوم کے خلاف کا لحاظ کرتے ہوئے ایک وفد مشاہدے کی غرض سے مکہ مکرمہ عمرے کے لئے روانہ کیا گیا، اس وفد میں دارالعلوم کے بھی ایک مفتی حضرت مولانا مفتی

۱

حسین احمد صاحب زید مجدہم شامل تھے لیکن دار العلوم نے (اپنی رائے کو تحفظ دینے کے لئے) اپنے خرچ پر ایک زائد مفتی صاحب (مفتی تفضّل علی شاہ صاحب زید مجدہم) کو بھی وفد کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ کیا، ارکانِ وفد نے اس مزید کو اکابر کا احترام کرتے ہوئے قبول کر لیا لیکن اتفاق (بلکہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی فیصلے جس میں خاص حکمتیں ہوتی ہیں) سے اس پورے وفد کا سوائے مفتی تفضّل علی صاحب کے ویزہ لگ گیا۔

وفد وہاں پہنچ کر عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد اپنے تمام تر احتیاط پر مبنی مشاہدات اور اتفاقی تحریر اور اس پر دستخطوں سے فارغ ہوا ہی تھا کہ مفتی تفضّل صاحب کا ویزہ آیا اور وہ بھی پہنچ گئے۔

انھوں نے وفد سے دوبارہ مشاہدات کے لئے کہا لیکن وفد نے صاف کہہ دیا کہ چونکہ آپ وفد کے ارکان میں شامل نہیں اس لئے آپ کے ساتھ دوبارہ مشاہدات کے ہم مکلّف نہیں۔ چونکہ مفتی حسین احمد صاحب دار العلوم ہی کے نمائندہ تھے اس لئے ان کو اپنے ساتھ لیا اور دوبارہ مشاہدات کئے۔

مشاہدات کے بعد جو تحریر انھوں نے مرتب کی وہ وفد کی اجتماعی تحریر کے خلاف تھی۔

دار العلوم کراچی کے اکابر نے اجتماعی، اور پورے پاکستان، اور سہ روزہ اجتماع میں شریک مفتیانِ کرام کے نمائندہ وفد کی مشاہداتی تحریر (جو ان کی رائے کے خلاف تھی) کو رد کر دیا اور مفتی تفضّل علی صاحب کی تحریر کو قبول کرتے ہوئے اپنی رائے پر جمے رہے۔ پھر اُسی سال حج پر تشریف لے جا کر منیٰ میں جمعہ بھی پڑھایا۔

حجاجِ کرام جانتے ہیں کہ اس مسئلہ کی وجہ سے ہر خیمے میں کتنے جھگڑے اور اختلافات ہوتے ہیں، کوئی دو رکعات کی جماعت کرواتے ہیں اور کوئی چار کی، دو رکعات والے چار پر اور چار والے دو پر اعتراض کرتے ہیں اور بعض اوقات تو زبان سے بڑھ کر ہاتھا پائی کی نوبت

بھی آجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطاء فرمائے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے احباب کو جنہوں نے امت کے اس انتشار کے خاتمے اور وحدت و یگانگت پیدا کرنے کے لئے بھاری مصارف برداشت کئے، بہت بڑا اجتماع بلوایا اور انتہائی افسوس اور تعجب ہے دار العلوم والوں پر جنہوں نے اپنی رائے کو بقا دیتے ہوئے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے احباب کی ان تمام کوششوں کو اکارت اور ضائع کیا۔

تنبیہ: وفد کی اجتماعی روئیداد طوالت کے خوف سے نقل نہیں کی گئی جن علماءِ کرام کو ضرورت ہو وہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں حضرت مولانا مفتی عبد المجید دین پوری زید مجدہم سے وصول کر سکتے ہیں۔

اس تلخ مشاہدے کے باوجود بندہ کئی احباب سمیت حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت اگر انھوں نے غور و فکر کی دعوت نہیں دی.... آپ انھیں ضرور دعوت دیجئے۔ اس پر انھوں نے ایک واقعہ بتلا کر کہا کہ ذرا جھکاؤ پر اس قسم کی باتیں کی گئی ہیں اگر دعوتِ غور و فکر دوں گا تو نہ معلوم کیا کیا باتیں بنائی جائیں گی۔

اس پر بندے نے عرض کیا کہ جو باتیں آپ کو پہنچائی گئی ہیں خالص جھوٹ ہیں، جن کی طرف یہ باتیں منسوب کی گئی ہیں ان سے ایسی باتوں کا ہونا ناممکن ہے، درحقیقت ایسی باتیں شریر اور مفسد لوگ نفرتیں اور دوری پیدا کرنے کے لئے بنایا کرتے ہیں۔

اس مجلس میں حضرت کو بعض اسی قسم کی بنائی ہوئی کچھ باتیں بتلائی گئیں جو حضرت زید مجدہم کی طرف منسوب تھیں، فرمایا ہمیں تو اس کا علم نہیں۔

بندے نے کہا کہ حضرت ان گھڑی ہوئی باتوں پر توجہ نہ فرمائیں بلکہ ضرور انھیں دعوت دیجئے، حضرت نے فرمایا کہ آپ ثالثی کا کردار ادا کرتے ہوئے مجوزین اور مانعین کو جمع

۸۳

کریں، بندے نے عرض کیا: میں اس کے لئے تیار ہوں، لیکن مانعین کا کہنا ہے کہ اختلافی مسائل میں دارالعلوم کے احباب کے ساتھ بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ دارالعلوم والے اجتماع بلواتے ہیں، غوروفکر کرتے ہیں لیکن فیصلہ اصول کے خلاف کرتے ہیں۔ حضرت شیخ مدظلہ نے فرمایا وہ کس طرح؟ بندے نے عرض کیا: وہ فرماتے ہیں کہ علامہ بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو اصول تحریر فرمائے ہیں ان میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ اجتماعی غوروفکر کے بعد عوام کو اکثریت ہی کی رائے بتلائی جائے اقلیت اپنی رائے اپنے پاس ہی رکھے عوام کو نہ بتلائے، اس پر حضرت شیخ زیدمجدہم نے فرمایا کہ کیا پھر میں اپنی رائے کسی کو نہیں بتاؤں گا؟ جس پر بندے نے عرض کیا میں کچھ نہیں کہتا ہوں، کتاب ''مروجہ اسلامی بینکاری'' کے شروع میں حضرت علامہ بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے جو اصول لکھے ہوئے ہیں، اُن میں یہ بات بھی ذکر کی گئی ہے، لہٰذا آپ اس کتاب کے مقدمے کو بھی ملاحظہ فرمایئے اور اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ آپ کی جو تحقیقی نشستیں ہوئی ہیں اس مشاہدہ اور تجربہ کو بھی سامنے رکھئے، اور دونوں کی روشنی میں ایک تو تحقیقی مجلس میں گفتگو کے لئے ضابطۂ اخلاق، دوسرا غورو فکر کے بعد فیصلہ کے اصول تحریر فرمائے جائیں، بندہ دوسری جانب کے حضرات سے بات بھی کرلے گا۔ جب اصول متفقہ طور پر طے ہوجائیں تو اجتماع بلوالیا جائے گا۔

اس کے بعد دوسرے تیسرے دن بندہ مع احباب مانعین کے مرجع بقیۃ السلف شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور مغرب تا عشاء اس موضوع پر تفصیل سے بات ہوئی، حضرت دامت برکاتہم نے کھلے دل سے فرمایا کہ اچھی بات ہے، جب اصول طے ہوجائیں تو بات کرلی جائے۔ حضرت کی رضا اور خوشی کے بعد بندہ نے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زیدمجدہم کو بھی اور مفتی تفضل علی شاہ صاحب کو بھی اس کی اطلاع کردی کہ اصول اور ضابطہ اخلاق مرتب فرمالئے

جائیں، مانعین حضرات مل بیٹھ کر غوروفکر کے لئے تیار ہیں۔

بندہ کئی مہینوں تک اس انتظار میں رہا کہ بس آج کل میں اصول مرتب کرکے بندہ کو بلوایا جائیگا، یا کسی کے واسطے سے محررہ اصول بھجوائے جائیں گے، لیکن کئی مہینے گزر گئے اور اصول کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ پھر ایک دن اس امید پر بندہ مع احباب دارالعلوم پہنچا کہ شاید بالمشافہ ملاقات میں اجتماعی غور کی بات کچھ آگے بڑھے گی، لیکن اس ملاقات نے تو مایوس ہی کردیا۔ جب حضرت کے سامنے گذشتہ مجلس اور اصول وضوابط کی بات کی تو حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے جواب میں یہ شعر پڑھا...... ع

''مشتے کہ بعد از جنگ یاد می آید　　باید کہ بر کلہ خود می زند''

یعنی وہ مکا جو لڑائی کے بعد یاد آئے وہ اپنے ہی جبڑے پر مارنا چاہئے، اور فرمایا کہ اب تو جوابی کتاب چھپ کر بائنڈنگ کے مراحل میں ہے...... جبکہ اس سے پہلے کی مجلس میں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زیدمجدہم نے بڑی قوت سے فرمایا تھا کہ ایک غلطی ہوگئی، اب دوسری نہیں ہوگی...... بلکہ مفتی تفضل علی شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت نہ تو خود جواب دینا چاہتے ہیں اور نہ ہی ہمیں اجازت دیتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ حضرت جواب کے حق میں نہ تھے۔ حضرت جواب کے لئے کیونکر آمادہ ہوئے؟ واللہ تعالیٰ اعلم

اربابِ علم و دانش! اس تفصیلی روئیداد کو ملاحظہ فرماکر خود فیصلہ فرمائیں کہ ہماری اس اجتماعی غوروفکر کی کوشش کی ناکامی کا سبب مانعین ہیں یا مجوزین؟ اور آپس میں نہ مل بیٹھنے کا الزام مانعین پر لازم آتا ہے یا مجوزین پر؟

آج بھی مانعین اس بات کے لئے تیار ہیں کہ جب بھی مجوزین حضرات کی طرف سے اس مسئلے پر یا اور کسی بھی مسئلے پر اجتماعی گفتگو کا ارادہ ہو تو مانعین حضرات حاضر ہیں، بشرطیکہ غوروفکر اور اجتماع نفع بخش، مفید اور نتیجہ خیز ہو اور یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ

۵

کے تحقیقی مسائل سے متعلق اُن کی تحریرات کی روشنی میں فیصلے کے اصول اتفاق رائے سے متعین کیئے جائیں۔

کتاب ''غیر سودی بینکاری'' کا خلاصہ

ہماری سمجھ کے مطابق پوری کتاب ''غیر سودی بینکاری'' تین اہم حصوں پر مشتمل ہے۔

(۱) بینک مخالفین کے اعتراضات غلط معلومات پر مبنی ہیں (جس میں کئی اعتراضات کا ذکر ہے)

(۲) بظاہر ''نزاعِ لفظی'' پر مشتمل ایک بہت ہی ضخیم حصہ (جس میں مرابحہ مؤجلہ وغیرہ کی تفصیلی بحث ہے)

(۳) اسلامی معیشت وتجارت اور بینکنگ سے متعلق مسائل شرعیہ

نمبر (۱) سے متعلق ہم حضرت مدظلہ کے اعلان ''کہ بعض تحریروں میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے متعلقہ عقود کے کاغذات حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر وہ حاصل نہ ہوسکے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا کوشش تھی جو متعلقہ کاغذات حاصل کرنے کے لئے کی گئی، جبکہ اس کا آسان ترین راستہ یہ تھا کہ مجھ نیاز مند ہی کو اس خدمت کا موقع دے دیا جاتا'' (غیر سودی بینکاری صہ ۵۵، ۵۶) پر درج ذیل فہرست آنجناب سے طلب کی ہے۔

(۱) اسٹیٹ بینک کا غیر سودی بینکوں کو سودی قرضہ لینے دینے سے مستثنیٰ کرنے کی سند، جو اسٹیٹ بینک کی طرف سے جاری کی گئی ہو۔

(۲) اسٹیٹ بینک غیر سودی بینکوں کو شرکت ومضاربت کی بنیاد پر جو سرمایہ فراہم کرتا ہے اس شرکت میں اگر نقصان ہوجائے تو کیا اسٹیٹ بینک اس نقصان کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار ہے؟ اگر تیار ہے تو اسٹیٹ بینک کی طرف سے اس کی تحریر مطلوب ہے جس میں نقصان کی

ذمہ داری اٹھانے کا اقرار ہو۔

(۳) اسٹیٹ بینک نے غیر سودی بینکوں کے لئے سودی بینکوں سے علیحدہ جو قوانین مقرر کیئے ہیں اس کی تفصیلی دستاویز مطلوب ہیں۔

(۴) غیر سودی بینکوں میں جو اجارہ ومرابحہ رائج ہے اس کی تفصیلی دستاویز مطلوب ہے، جس میں مکمل طریقۂ کار مذکور ہو۔

(۵) ماسٹر مرابحہ ایگریمنٹ کی دستاویز

(۶) مضاربت وشرکت کے طریق کار کی دستاویز

(۷) مکانات میں شرکتِ متناقصہ کی دستاویز

(۸) سیکوریٹی ڈیپازٹ کے نام پر جمع کی جانے والی رقم کو اسٹیٹ بینک میں بلاسود جمع کرانے کا تحریری اور عملی ثبوت

نمبر (۲) چونکہ ہماری نظر میں محض نزاعِ لفظی ہی ہے لہٰذا اس سے بالکلیہ احتراز اور صرفِ نظر کیا گیا ہے۔

نمبر (۳) میں جن مسائل میں کلام تھا، ان پر تبصرہ کرکے اپنے تحفظات نقل کردیئے ہیں، البتہ ایک بات بطورِ خاص یہاں لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اس کتاب سے بندہ کو کیا فائدہ ہوا؟

الحمد للہ تعالیٰ اس کتاب ''غیر سودی بینکاری'' کے مطالعہ سے کافی ابہامات اور شکوک و شبہات دور ہوگئے اور اب بندہ اطمینان سے یہ کہہ سکتا ہے کہ موجودہ اسلامی نامی بینکنگ غلط عقود فاسدہ اور کئی دوسرے خلاف شرع امور کا مجموعہ ہے، لہٰذا ان بینکوں میں سرمایہ لگانا اور اس پر نفع لینا ناجائز، حرام اور بحکمِ سود ہے، اور سود پر قرآن وحدیث میں سخت وعیدیں وارد

ہوئی ہیں۔جن میں سے بعض ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

نیز ہر ایسا کاروبار جس میں سود کا شبہ بھی ہو اس سے بھی ہر سچے اور دین دار مسلمان کو بچنے کا اہتمام کرنا چاہئے اور کاروبار کی وہ صورتیں جن پر علماء کا اتفاق ہے، کو اختیار کرنا چاہئے۔وما علینا الا البلغ المبین

﴿سود پر وعیدیں﴾

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں سودخوروں کے لئے سخت ترین وعیدیں بیان کی گئی ہیں،جن میں سے بعض یہ ہیں۔

(۱) سودخوروں کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔

قال اللہ عز و جل : یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ و ذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مؤمنین. فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللہ و رسولہ.(البقرۃ ۲۷۸/۲۷۹)

ارشاد باری تعالیٰ ہے :اے ایمان والو !اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر ایمان والے ہو۔پھر اگر تم نہ کرو گے تو اعلان سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے۔

(۲) سود کھانا کبیرہ اور تباہ کن گناہ ہے۔

عن أبی ھریرۃ ﷺ عن النبی ﷺ قال :اجتنبوا السبع الموبقات قالوا : یا رسول اللہ وما ھن قال : الشرک باللہ والسحر و قتل النفس التی حرم اللہ الا بالحق و أکل الربوا وأکل مال الیتیم والتولی یوم الزحف و قذف المؤمنات الغافلات(متفق علیہ، المشکوۃ ۱۷/۱)

۸۸

''حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا :سات مہلک گناہوں سے بچو ! صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا :یارسول اللہ ﷺ!وہ کون سے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :اللہ کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا، جادو کرنا، اس جان کو ناحق قتل کرنا جس کا قتل اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے مگر جائز طور پر (بحکم شریعت)،سود کھانا،یتیم کا مال کھانا،اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے گھمسان کی جنگ میں پیٹھ پھیر کر بھاگنا اور پاک دامن بے خبر مؤمنہ بیبیوں پر تہمت لگانا۔''

(۳) سود کھانے والے،کھلانے والے،لکھنے والے اور اس پر گواہ بننے والے سب ملعون ہیں۔

عن جابر ﷺ قال : لعن رسول اللہ ﷺ اکل الربا و موکلہ و کاتبہ و شاھدیہ و قال ھم سواء (مسلم ۲۷/۲)

''حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے،سود کی تحریر لکھنے والے اور سود پر گواہ بننے والوں پر لعنت بھیجی اور فرمایا یہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔''

(۴) اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ سودخوروں کو جنت میں داخل نہ کرے۔

عن أبی ھریرۃ ﷺ قال : قال رسول اللہ ﷺ : أربعۃ حق علی اللہ أن لا یدخلھم الجنۃ ، ولا یذیقھم نعیمھا : مدمن الخمر ، وآکل الربا، وآکل مال الیتیم بغیر حق ، والعاق لوالدیہ(المستدرک للحاکم ۳۳۸/۲)

۹

’’حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں :رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا: چار شخصوں سے متعلق اللہ تعالی نے اپنا ذمہ لیا ہے کہ انھیں جنت میں داخل نہ کریں گے اور نہ اس کی نعمتیں چکھائیں گے۔

۱ ۔شراب کا عادی ۲ ۔سودخور ۳ ۔ناحق یتیم کا مال اڑانے والا ۴ ۔والدین کا نافرمان‘‘

(۵) سود میں ادنی ترین گناہ جیسے کوئی اپنی سگی ماں سے بدکاری کرے۔

عن عبداللہ ؓ عن النبی ﷺ قال : الربا ثلاثة وسبعون بابا ، أيسرها مثل أن ينكح الرجل أمه ، وان أربى الربا عرض الرجل المسلم(المستدرک للحاکم ۲/۳۳۸)

حضرت ابن مسعود ؓ فرماتے ہیں :نبی اکرم ﷺ نے ارشادفرمایا :سود میں تہتر گناہ ہیں جن میں ادنی ترین گناہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں سے بدکاری کرے،اور بدترین سود کسی مسلمان کی آبروریزی ہے۔

(۶) ایک درہم سود کا چھتیس زنا سے بدتر ہے۔

عن عبداللہ بن حنظلة غسیل الملائکة ؓ قال : قال رسول الله ﷺ : درهم الربا يأكله الرجل و هو يعلم ، أشد من ستة و ثلاثين زنية.(مسند الامام أحمد ۶/۲۹۶)

’’ابن حنظلہ غسیل الملائکہ ؓ فرماتے ہیں :رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :سود کا ایک درہم جسے کوئی جانتے ہوئے استعمال کرے چھتیس زنا سے بدتر ہے۔‘‘

(۷) سود کی ترویج اللہ تعالی کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔

۹۰

عن ابن مسعود ؓ عن النبی ﷺ فذكر حديثا و قال فيه : ما ظهر في قوم الزنا و الربا الا أحلوا بأنفسهم عقاب الله. (مجمع الزوائد ۴/۲۱۳)

’’حضرت ابن مسعود ؓ فرماتے ہیں : نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا : جس قوم میں زنا اور سود کا ظہور ہوا اس قوم نے یقیناً اللہ تعالی کا عذاب اپنی جانوں پر اتار لیا۔‘‘

خویدم العلماء

احمد ممتاز

۲۳/شعبان المعظم ۱۴۳۰ھ

دارالافتاء جامعۃ الرشید کی کتاب
''غیرسودی بینکاری
فقہی تصور، ضرورت واہمیت،
اہم مسائل کی تحقیق''
اور
مولانا مختارالدین شاہ صاحب کی کتاب
''بلاسود بینکاری کے خلاف بعض علماء کے فتویٰ کی حقیقت
اس کا پس منظر و پیش منظر''
پر مختصر تبصرہ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم کی کتاب ''غیرسودی بینکاری'' پر تبصرہ یہاں تک مکمل ہو چکا۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کے ارشاد پر جامعۃ الرشید کی کتاب کا بھی مطالعہ کر کے اپنے تحفظات لکھ چکا تھا، لیکن اس کی ترتیب ابھی باقی تھی، احباب نے یہ مشورہ دیا کہ اگر جامعۃ الرشید سے شائع ہونے والی کتاب اور حضرت مولانا مفتی مختار الدین صاحب مدظلہ کی کتاب، دونوں کا مختصر جواب بھی ساتھ شائع ہو جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

احباب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بندہ نے دونوں پر مختصر تبصرہ لکھ کر اس کتاب کا جزء بنا دیا اور اب یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، بجائے ایک کے تین کتابوں کا جواب ہے۔

احمد ممتاز

۳

دارالافتاء جامعۃ الرشید کی کتاب ''غیر سودی بینکاری''

پر مختصر سرسری تبصرہ

''غیر سودی بینکاری'' کے نام سے ایک کتاب ''حضرات رفقاء دار الافتاء و الارشاد کراچی'' کے حوالے سے ''جامعۃ الرشید کراچی'' سے شائع ہوئی ہے (معلوم نہیں جامعۃ الرشید کی بجائے دارالافتاء والارشاد کیوں لکھا گیا ہے؟ حالانکہ آج کل فتاوی اور تحقیق کا سارا کام ہماری معلومات کے مطابق جامعۃ الرشید میں ہو رہا ہے) جس میں ایک تو مذہب غیر پر عمل کے دائرے کو وسیع تر سے وسیع تر باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے، اور دوسرا یہ تأثر دیا گیا ہے کہ گویا بینک کا موجودہ خاکہ حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی حیات ہی میں مجلسِ تحقیق نے متفقہ طور پر منظور کیا تھا جس کی تفصیل خود حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے احسن الفتاویٰ میں تحریر بھی فرمائی ہے۔

بقیۃ السلف استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم نے اس کتاب سے متعلق بھی تبصرہ کا حکم دیا تھا، جس بنا پر بندہ نے تعمیلِ حکم میں یہ پوری کتاب پڑھی اور اپنے تحفظات لکھنا شروع کر دیئے، چنانچہ اس کتاب کے مندرجات سے متعلق نمبروار چند گزارشات پیش خدمت ہیں۔

﴿۱﴾ اس کتاب میں فتویٰ بمذہبِ غیر کی تین شرطیں لکھی گئی ہیں۔

(الف) ضرورت شدید ہو اور وہ اپنے مذہب میں پوری نہ ہو سکتی ہو۔

(غیر سودی بینکاری جامعۃ الرشید ۲۶)

(ب) حکمِ واحد میں تلفیق لازم نہ آئے۔

(غیر سودی بینکاری جامعۃ الرشید ۳۴،۳۵)

۹۴

(ج) فتویٰ دینے والوں میں اجتہادی صلاحیت ہو یا مسائل میں بصیرت تامہ ہو۔

(غیر سودی بینکاری جامعۃ الرشید ۳۶)

اُقول: شرط نمبر ایک سے معلوم ہوا کہ اس کے تحقق کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ''وہ ضرورت اپنے مذہب میں پوری نہ ہو سکتی ہو''، جبکہ رہن اور وثیقہ کے ذریعے اپنے مذہب میں رہتے ہوئے مماطل کے شر سے بچنے کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے لہٰذا اس کے لئے خروج عن المذہب جائز نہ ہوگا اور یہ صرف دعویٰ ہی نہیں بلکہ امر واقعی ہے۔

دیکھئے مرابحات واجارات ان اسلامی نامی بینکوں کے وجود میں آنے سے قبل بھی جاری تھے اور آج بھی بازاروں میں جاری ہیں، لیکن مسلمان تاجروں نے اس التزام کی ضرورت نہیں سمجھی، اگر مجوزین حضرات اس کے خلاف کے مدعی ہیں تو ان حضرات کے ذمہ دو باتوں کا ثبوت پیش کرنا لازم ہے۔

ایک یہ کہ دس بارہ سال قبل جب یہ بینک وجود میں نہیں آئے تھے اس وقت بھی تجار ادھار معاملات کے لئے التزامِ تصدق اور التزامِ وعد جیسے خلافِ شرع شرائط لگا کر معاملات کیا کرتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ آج کل بازار میں ادھار کے جتنے معاملات ہو رہے ہیں وہ لوگ بھی ان خلافِ شرع شرائط کے ساتھ کرتے ہیں۔

اگر مجوزین حضرات اس کا ثبوت پیش نہیں کر سکتے (اور یقین ہے کہ پیش نہیں کر سکیں گے کیونکہ اس التزام کو ان مجوزین علماءِ کرام سے پہلے ضروری سمجھنا تو در کنار کوئی جانتا تک نہ تھا اور نہ ہی آج عام تاجر اس سے واقف ہیں) تو آیئے ہم مشاہدہ کراتے ہیں کہ ان بینکوں کے وجود سے قبل بدون التزام کے لوگ ادھار معاملات کیا کرتے تھے اور آج بھی کر رہے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مذہب غیر پر فتویٰ دینے کی پہلی شرط یہاں مفقود ہے

۵

لہٰذا ''اذافات الشرط فات المشروط '' کے ضابطہ کے مطابق بینک کے لئے ادھار معاملات میں مذہبِ غیر پر فتویٰ اور عمل جائز نہیں اور یہ خروج عن المذہب ناجائز اور شرائطِ جواز سے محروم ہے۔

تنبیہ: یہ التزام ہے یا لزومِ التزام؟ اس کی تفصیل مالہ وماعلیہ کے ساتھ ماسبق میں ملاحظہ فرمایئے۔

شرط نمبر۲ کے آخر میں لکھتے ہیں:

''صرف چند مسائل جیسے الزام الوعد، التزامِ تصدق وغیرہ میں بضرورت مالکیہ کا مذہب لیا گیا ہے۔'' (صہ۳۴، ۳۵)

اُقول: الزام الوعد میں بقولِ مجوزین جب حنفیہ، شافعیہ، حنابلہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وعدہ کا پورا کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے اور مکارمِ اخلاق میں سے ہے، بعض مالکیہ کا بھی یہی قول ہے۔ دیکھئے غیر سودی بینکاری ۱۳۸ پر بحوالہ عمدۃ القاری ۱۲/۱۲۱، مرقاۃ ۴/۶۵۳، الاذکار للنووی صہ۲۸۲، مذکور ہے۔

اب مذہبِ غیر پر عمل کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟....تو خود حیلہ ناجزہ کے لکھنے والے حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کہ یہ الزام حرام اور ناجائز ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں عنوان ''اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کس کے ساتھ ہیں'' کے تحت آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کا فتویٰ موجود ہے، ملاحظہ فرمایا جائے۔ اگر ضرورت ہوتی تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ جواز کا فتویٰ دیتے، اسکے خلاف حرام کا فتویٰ دینا عدمِ ضرورت کی واضح دلیل ہے۔

شرط نمبر۳ کے تحت لکھتے ہیں:

''اس لئے مستند اہلِ افتاء کو اس کا ادراک ہونا چاہئے کہ حوائج الناس کی تحقیق وتفتیش اہلِ افتاء کی ذمہ داری ہے اور اگر کسی جگہ حرج وابتلائے

۹۶

شدید پیش آئے تو کسی بھی مذہب کے مطابق اس کا حل پیش کرنا بھی ان کے فریضے کا حصہ ہے'' (صہ۳۶)

اُقول: مستند اہلِ افتاء کون ہیں؟

جامعہ علوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے حضرت مفتی عبدالمجید دین پوری زید مجدہم، جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی کراچی کے مفتی منظور احمد مینگل، مفتی سمیع اللہ زید مجدہم (یہ وہ حضرات مفتیانِ کرام ہیں جن کو تحقیقی مسائل میں دارالعلوم کراچی مدعو کیا جاتا ہے) جامعہ اشرفیہ لاہور کے حضرت مفتی حمید اللہ جان صاحب زید مجدہم، جامعہ مدنیہ لاہور کے مفتی ڈاکٹر عبدالواحد صاحب زید مجدہم، جامعہ خیر المدارس ملتان کے حضرت مفتی عبداللہ صاحب زید مجدہم، جامعہ اشرفیہ سکھر کے حضرت مفتی عبدالغفار صاحب زید مجدہم، جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ کوئٹہ کے مفتی گل حسن صاحب زید مجدہم، مدرسہ تعلیم القرآن دارالافتاء ربانیہ کوئٹہ کے مفتی روزی خان صاحب زید مجدہم وغیرہ وغیرہ، حضرات مفتیانِ کرام مستند اہلِ افتاء میں داخل ہیں یا نہیں؟

ان مستند اہلِ افتاء کی تعین کون کرے گا؟

اس کی تعیین کا معیار کیا ہے؟

ان مستند اہلِ افتاء کا آپس میں اختلاف ممکن ہے یا نہیں؟

اگر ممکن ہے تو اختلاف کی صورت میں فیصلہ اکثریت کی بنیاد پر ہوگا یا دلائل پر؟

اکثریت پر فیصلے کی کیا دلیل ہے؟

دلائل پر فیصلہ کرنے کی صورت میں قوتِ دلیل کا فیصلہ کون کرے گا؟

﴿۲﴾ مؤدبانہ گزارش ہے کہ جہاں سودی نظام کے خاتمے کی اہمیت ہے وہاں سود میں ابتلاء کے خطرات سے ہوشیار رہنے کی اہمیت بھی اس سے کچھ کم نہیں۔

ے

لہٰذا سودی نظام کو حاجات الناس اور ضرورت الناس کے جاذب عنوانات کے ذریعے مذہب غیر اور اقوالِ مرجوحہ، ضعیفہ کے سہارے ختم کرنے کے جذبہ سے کہیں زیادہ یہ جذبہ اور فکر ہونا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ ہماری ان رخصتوں کی وجہ سے امت کے سود سے بچے ہوئے افراد بھی سود اور حرام کی لعنت میں مبتلاء ہو جائیں۔

﴿۳﴾ مکیلات وموزونات میں حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول پر فتویٰ سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''وہ حضرات غور کریں جو حل وحرمت کے تعارض میں حرمت کی ترجیح کو مطلق کہتے ہیں'' (غیر سودی بینکاری، جامعۃ الرشید ۳۸)

اَقول: اولاً: حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کو ترجیح دینے والے (بقول شما ''دیگر فقہاء'') حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں جو دلائل اور مرجحات سے خوب واقف تھے

ثانیاً: حضرات فقہاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے محظورات وحاجات کے علاوہ نص کے اصل مبنی کو بیان کر کے پہلے نص کو عرف کی وجہ سے مقید کیا تا کہ نص کی مخالفت لازم نہ آئے، جیسا کہ خود لکھتے ہیں:

> ''اس پر اشکال یہ ہے کہ یہ نص حدیث کے خلاف ہے، علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ یہ نص کے خلاف نہیں، بلکہ نص کی تفسیر و تاویل ہے، کیونکہ نص خود مبنی بر عرف ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عرف یہی تھا، اس لئے آپ نے یہ ارشاد فرمایا اور اگر اس کے خلاف عرف ہوتا تو آپ یہ نہ فرماتے'' (غیر سودی بینکاری جامعۃ الرشید ۳۷)

اس تعیین کے بعد حاجات ومحظورات سے ترجیح دی۔

تقیید نص کے بغیر نص (موجب سود) کی مخالفت کے لئے تنہا محظورات اور حاجات

الناس کافی نہیں۔

آج ہزاروں لاکھوں مسلمان ایسے ہیں جن کی رقمیں سودی بینکوں میں لگی ہوئی ہیں، اور وہ سود جیسے حرام میں مبتلا ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ سارے کے سارے فاسق، حرام خور اور گمراہ ہو رہے ہیں...... دیکھئے یہاں محظور اور حاجت ہے۔

اب میں ان حضرات سے پوچھتا ہوں کہ ان کو اس فسق وگمراہی سے بچانے کے لئے یہ جائز ہوگا کہ سود کی دو قسمیں بنالی جائیں؟ تجارتی سود، غیر تجارتی سود۔ پھر تجارتی سود کو اس تاویل سے جائز کہا جائے کہ یہ سود نہیں بلکہ بینک کی عمارت، فرنیچر، رجسٹر، بھاری تنخواہ دار ملازمین وغیرہ وغیرہ کی اجرت اور فیس ہے، لہٰذا جائز ہے۔ جیسے کریڈٹ کارڈ کے جواز کا مجوزین حضرات نے فتویٰ دے کر اس کارڈ کے اضافے کو سود سے نکال کر فیس میں داخل کر کے حلال کہا ہے۔ چونکہ یہاں ہزاروں مسلمانوں کا فسق وضلالت میں وقوع کا مسئلہ ہے لہٰذا ان لاکھوں کو فسق سے بچانے کے لئے جواز کا فتویٰ دینا چاہئے۔

یہاں فتویٰ نہ دینا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ تنہا محظورات کسی نص کی مخالفت کے لئے کافی نہیں اور نص موجب ربح وسود کی تقیید کسی ماہر سے ثابت نہیں لہٰذا نصِ حرمتِ ربا، تجارتی و غیر تجارتی دونوں قسموں کو شامل ہوگی۔

الحاصل: تنہا محظورات اور حاجات الناس کو حرمت کے مقابل لا کر ان کے ذریعے مرجوح قول کو ترجیح دینا اور نص کی مخالفت کرنا ہرگز ہرگز جائز نہیں۔

نیز امام کرخی رحمہ اللہ تعالیٰ جو مشہور امام ہیں ان کے قول کے مطابق تو ڈاکو، چور، غاصب، راشی، سود خور اور ہر قسم کا حرام خور، حلال خور ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں بیع العین بالدین میں دین ذمہ پر آتا ہے، لہٰذا بعد میں اگرچہ وہ مالِ حرام سے ادا کرے لیکن یہ خریدا ہوا کھانا اور سامان ان کے قول کے مطابق حلال ہے۔

آنحضرات کو امت کے چوروں، ڈاکوؤں، رشوت خوروں اور سب حرام خوروں پر رحم کھا کر جمہور فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے قول کو چھوڑ کر امام کرخی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول پر محظورات اور حاجات الناس کی وجہ سے جواز کا فتویٰ دینا چاہئے۔

اس فتویٰ کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ سارے حرام خور، حلال خور بن جائیں گے، ان کی نمازیں دوسری عبادتیں حرام کھانے کی وجہ سے اکارت اور ضائع نہ ہونگی۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ کتنے حلال کھانے کا اہتمام کرنے والے اپنے قریبی رشتے داروں کے ہاں اس وجہ سے کچھ کھاتے پیتے نہیں کہ ان کا مال حرام ہے اور مالِ حرام سے خریدا ہوا کھانا بھی حرام ہوتا ہے۔ اس فتوے کی وجہ سے یہ حرام بھی حلال ہو جائے گا، اور یہ لوگ اپنے ان رشتہ داروں کے ہاں خوب کھا پی سکیں گے اور حرام سمجھتے ہوئے نہ کھانے کی وجہ سے جو آپس کی منافرت اور دوری تھی وہ بھی ختم ہو جائے گی۔

لیکن فتویٰ دینے سے پہلے یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان محظورات اور حاجات الناس کی وجہ سے اس مشہور امام کے قول پر فتویٰ نہیں دیا۔

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے رسالہ بنام ''حلال وحرام سے مخلوط مال کا حکم'' میں جگہ جگہ بعض عبارات جواز کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ یہ قولِ کرخی رحمہ اللہ تعالیٰ پر مبنی ہے۔

جامعۃ الرشید کے احباب سے گزارش ہے کہ حاجات الناس کی وجہ سے حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلاف فتویٰ دیں، کیونکہ حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس فتویٰ کی وجہ سے کتنے لوگ حرام خور بنے ہوئے ہیں، اور کتنے خاندانوں میں اس بنیاد پر آئے دن لڑائیاں اور جھگڑے جنم لے رہے ہیں۔

﴿۴﴾ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ان بینکوں میں کئی خلافِ شرع امور ایسے ہیں جن کے ناجائز

ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ مجوزین حضرات ائمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے مذاہب میں سے کسی ایک کے مذہب کا کوئی مضبوط اور اتفاقی قول جواز کا نہیں دکھا سکتے، اور کتنے ایسے امور ہیں جن کو اپنے مذہب کے راجح اور قوی اقوال سے ثابت نہیں کر سکتے۔ ان امور میں سے بعض یہ ہیں۔

(۱) یومیہ پیداوار کی بنیاد پر منافع کی تقسیم کا طریق کار۔

(۲) بنام سیکورٹی ڈپازٹ اور ایڈوانس قرض کی بنیاد پر مرابحہ واجارہ کا نفع حاصل کرنا۔

(۳) محدود ذمہ داری کے تصور پر بیع وشراء کرنا۔

(۴) کل رأس المال کی جہالت کے باوجود شرکت ومضاربت کا صحیح ہونا۔

(۵) بدوں تجدید، قبضِ امانت کا قبضِ ضمان بننا۔

(۶) شرکتِ عقد میں شریک کو اور مضاربہ میں رب المال کو ملازم رکھنا۔

(۷) اجارہ میں بعض مدت کی اجرت کا مجہول ہونے کے باوجود اجارہ کا صحیح ہونا۔

(۸) پہلے اجارہ کا وعدہ کیا، پھر وعدے کے مطابق اجارہ کیا، ایک ماہ بعد عذر کی وجہ سے اجارہ فسخ کرنا چاہا تو نقصان کے بغیر فسخ نہیں کر سکتا، یہ کس مذہب میں ہے؟

﴿۵﴾ صفحہ ۴۰ پر لکھتے ہیں:

''احسن الفتاویٰ میں جو غیر سودی بینکاری کا خاکہ ہے، اس کی تصدیق اس وقت کے چوٹی کے اصحابِ افتاء نے کی ہے، اس زمانے کے کسی ایسے عالم سے اس بارے میں اختلاف سامنے نہیں آیا جو فقہ وفتویٰ میں معروف ہو۔

لہٰذا بینکاری کے فتویٰ میں مذہبِ غیر پر فتویٰ دینے کے سلسلے میں جو اجتماعیت کی شرط ہے وہ یقیناً حاصل تھی اور اس وقت اہل افتاء کے اجتماع یا اکثریت کی واحد صورت یہی تھی۔'' (غیر سودی بینکاری، جامعۃ الرشید ۴۰)

اُقول: جامعۃ الرشید کے احباب کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے احسن الفتاویٰ کے حوالے سے اس انداز میں بات پیش کی ہے کہ گویا حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہم کا پیش کردہ پورا خاکہ مکمل تفصیلات کے ساتھ حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی موجودگی میں ان اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، اور آج کل جو کچھ ان بینکوں میں ہو رہا ہے ان سب معاملات کی گویا ان اکابر مفتیانِ کرام نے اجازت دی ہے۔

عام اور سادہ لوح مسلمان تو یقیناً جامعہ کی اس کتاب اور اس قسم کے جملوں سے یہی تأثر لیں گے لیکن اہلِ علم خصوصاً جن کے پیشِ نظر احسن الفتاویٰ کا یہ خاکہ ہے وہ کبھی یہ تأثر قبول نہیں کر سکتے۔

دیانت داری کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ حضرات نشاندہی فرماتے اور عوام کو بتلاتے کہ اس وقت ان اکابر کے سامنے صرف یہ چند امور اجمالاً زیرِ بحث آئے تھے اور بس، اور ان موجودہ بینکوں میں احسن الفتاویٰ کے خاکے میں ذکر کردہ کئی امور کے خلاف ہو رہا ہے۔

نیز یہ بھی بتلاتے کہ جو خاکہ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہم نے پیش کیا ہے یہ نہ احسن الفتاویٰ میں ہے اور نہ اُس وقت اکابر مفتیانِ کرام کے سامنے پیش ہوا تھا۔

آیئے! ہم دونوں خاکوں کا موازنہ کرتے ہیں اور جامعۃ الرشید کے احباب سے گزارش کرتے ہیں کہ چونکہ آپ نے موجودہ خاکے کو حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے سر تھوپا ہے لہٰذا ہر خاکے کا ہر ہر جزء دوسرے خاکے میں دکھانا آپ کے ذمہ لازم ہے۔

﴿دونوں خاکوں کا موازنہ﴾

(۱) موجودہ خاکے میں یومیہ پیداوار کی بنیاد پر منافع کی تقسیم کا طریق کار مذکور ہے...یہ احسن الفتاویٰ کے خاکے میں کہاں ہے؟

(۲) محدود ذمہ داری کی تجویز کو کن مفتیانِ کرام نے قبول کیا ہے؟...... اور احسن الفتاویٰ کے خاکے کے کس جملے میں اس کا ذکر ہے؟

(۳) عقد سے قبل وعدہ کا مفسدِ عقد نہ ہونا اور دیانۃً وقضاءً دونوں طرح لازم ہونا اور خلاف کی صورت میں کسی درجے میں مشتری اور مستأجر کو نقصان کا ذمہ دار اور ضامن قرار دینا...... احسن الفتاویٰ کے خاکے میں کہاں ہے؟ بلکہ احسن الفتاویٰ میں تو بیع الوفاء کے ضمن میں ایسے وعدوں کے مفسدِ عقد ہونے کی تصریح ہے۔

(۴) اجارہ اور مرابحہ کے عقد سے پہلے سیکورٹی ڈپازٹ کی شرط لگانا اور اجارے کی صورت میں پلگ، ٹائر، بیٹری، وائرنگ، رنگ وروغن وغیرہ مرمت کے خرچے کا مستأجر کو ذمہ دار ٹھہرانا...... احسن الفتاویٰ کے خاکے میں کہاں ہے؟...... اس میں تو صرف یہ ہے کہ:

> ''ایسے موقع پر بینک مشینری خرید کر عمیل کو کرائے پر دیدے، عموماً اسکا کرایہ مکمل کرنے میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ایک متعین مدت میں کرائے کے ذریعے مشینری کی کل لاگت منافع کے ساتھ وصول ہو جائے کرائے داری کی اس مدت میں مشینری بینک کی ملکیت میں ہوگی اور بینک پر ہی اس کی ذمہ داری ہوگی۔'' (احسن الفتاویٰ ۷/۱۲۳)

اس عبارت میں سیکورٹی ڈپازٹ کا ذکر کہاں ہے؟...... جبکہ بلٹی کے مسئلے میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے قرض کی بنیاد پر ایجار کو صراحۃً سود فرمایا ہے۔

نیز اس عبارت میں صراحت ہے کہ کرائے داری کی اس مدت میں مشینری بینک کی ملکیت ہوگی اور بینک پر ہی اس کی ذمہ داری ہوگی، اس میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ مرمت کا خرچہ مستأجر اور عمیل پر ہوگا؟

(۵) شرکتِ متناقصہ کے عنوان کے تحت جو مکانات کے معاملات ہوتے ہیں وہ احسن

الفتاویٰ کے خاکے میں کہاں ہیں؟

احسن الفتاویٰ میں جن دو صورتوں کا ذکر ہے اُن میں بیع مرابحہ مؤجلہ ہے، ایک صورت میں کل مکان کا اور دوسری صورت میں بینک کے حصے کا، اس میں اجارے والی صورت کا اتا پتا ہی نہیں .... حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

’’مکان وغیرہ کی خریداری کے لئے جو قرضے دیئے جاتے ہیں ان کے بارے میں رپورٹ میں یہ تجویز کیا گیا ہے۔

وہ بھی ’’مرابحہ مؤجلہ‘‘ کی بنیاد پر ہو یعنی ابتداءً مکان بینک خریدے اور اس غرض کے لئے عمیل ہی کو وکیل بنا دے اس کے بعد جب مکان بینک کی ملکیت میں آ جائے تو وہ عمیل کو مرابحہ کی بنیاد پر فروخت کر دے۔

اگر مکان تعمیر کرنا ہے تو تعمیر کی تکمیل کے بعد مکان عمیل کو مرابحۃً فروخت کیا جائے۔

اگر عمیل خریداری یا تعمیر میں اپنا بھی کوئی حصہ ڈالنا چاہتا ہے تو اس کی لگائی ہوئی رقم کو پیشگی بیعانہ کے طور پر سمجھا جائے (نہ کہ سیکورٹی ڈیپازٹ، احمد ممتاز)

دوسری صورت یہ ہے :

’’عمیل کا حصہ بطورِ شرکت کے ہو اور ملکیتِ مکان میں دونوں شریک ہونگے، بعد میں بینک اپنا حصہ عمیل کو ’’مرابحۂ مؤجلہ‘‘ کے طور پر فروخت کر دے گا۔

ابتداءً یہ صورت شرکتِ املاک کی ہوگی اور ثانیاً مرابحۂ مؤجلہ کی۔

دستاویز میں مرابحہ کا ذکر بطورِ وعدہ کے ہوگا۔‘‘ (احسن الفتاوی ۷/۱۲۳، ۱۲۴)

نیز اس میں خریداری کے وعدہ کا ذکر ہے۔ لیکن یہ کہاں ہے کہ اس وعدہ کی بنیاد پر اسے

مجبور بھی کیا جائے۔ اور یہ وعدہ بمنزلہ شرط کے ہوگا پھر بھی یہ مفسدِ عقد اور صفقۃ فی صفقۃ نہ ہوگا؟ اور مجبوری کی حالت میں اگر کوئی بینک کا حصہ بطور اجارہ یا بیع نہ لے سکتا ہو تو اس کو کسی حد تک نقصان کا ضامن بھی بنایا جائے گا؟

(۶) بدوں تجدید، قبضِ امانت کا قبضِ ضمان میں تبدیل ہونے کا تذکرہ احسن الفتاویٰ کے خاکے میں کس جگہ ہے؟...... بلکہ اس میں تو اس کے خلاف کی تصریح ہے۔ صفحہ ۱۱۹ پر مرابحۂ مؤجلہ کے عنوان کے تحت نمبر ۱۴ کی عبارت پر حاشیہ میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں۔

’’مجلس میں یہاں یہ اضافہ بھی کیا تھا جو غالباً سہواً تحریر سے رہ گیا ہے:

بینک عمیل کے قبضے کی تصدیق کے لئے اپنا کوئی نمائندہ بھیجے گا، قبضہ ثابت ہونے پر اس کا سرٹیفکیٹ دے گا۔ رشید‘‘ (احسن الفتاوی ۷/۱۱۹)

چونکہ خریداری کے بعد وکیل کی طرف سے بینک کو تصرف کا مکمل اختیار ہوتا ہے کہ جب چاہے مبیع لے لے لہٰذا نمائندہ کا مبیع کے پاس پہنچنے کی صورت میں اب یہ اختیارِ تصرف تخلیہ کی وجہ سے حکماً قبضہ سمجھا جائے گا، کیونکہ اس صورت میں بینک اگر چاہے تو اپنے نمائندہ کے واسطے سے اسی وقت اپنے قبضہ میں حقیقۃً لے سکتا ہے، لہٰذا یہ تخلیہ معتبر ہوگا البتہ نمائندہ بھیجے بغیر اختیاراتِ تصرف کو شرعاً تخلیہ اور قبض نہیں کہا جا سکتا۔ جس کی تفصیل عنوان ’’قبضِ امانت کا قبضِ ضمان میں بدوں تجدید تبدیل کرنا‘‘ کے تحت لکھ دی گئی ہے۔

(۷) موجودہ خاکے میں خریداری کے بعد وکیل اور عمیل کا بینک سے ہر صورت میں لینا ضروری ہے، اور اس کو خیارِ عیب وغیرہ کی وجہ سے رد کرنے کا حق نہیں، جبکہ شرعاً مؤکل کے قبضے میں جانے اور قبول کرنے کے بعد مؤکل کا عیب کی وجہ سے رد کرنے کا حق تو ختم ہو جاتا ہے، لیکن عمیل کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ اگر کسی عیب کی وجہ سے وہ خریداری سے انکار کر دے

تو کر سکتا ہے، جائز ہے۔ اس کو خریداری پر مجبور کرنا جائز نہیں۔ جیسا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے امداد الفتاویٰ میں صراحۃً فرمایا ہے۔

''سوال (٣٦): زید نے عمرو سے کہا میں تم کو روپیہ دیتا ہوں اور تمہارے لانے کی اور بار برداری کی اجرت اور کرایہ دیتا ہوں تم میرے اجیر بن کر مال لا دو تاکہ پھر تم اس مال میں نقص نہ بتاؤ۔

الجواب: اس کہنے سے عمرو کا حق مال کو ناقص بتلانے کا وقت بیع مرابحہ فیما بینہما زائل نہیں ہوا عمرو کو مثل مشتری اجنبی کے تمام حقوق حاصل ہیں البتہ زید کو یہ اختیار ہے کہ جس وقت عمرو اجیر وکیل ہونے کی حیثیت سے مال لایا ہے اگر ناقص مال لانے سے منع کر دیا تھا تو ناقص ہونے کی صورت میں عمرو سے بوجہ مخالفت کرنے کے روپیہ لے لے مگر جب مال کو قبول کر لیا تو زید کو تو کوئی حق نہیں رہا مگر عمرو کو یہی حق حاصل ہے۔''

(امداد الفتاوی ٣/٤١)

آنحضرات بتلائیں کہ:

احسن الفتاویٰ کے خاکے میں تکمیلِ بیع سے پہلے عمیل سے یہ حق چھیننے کا ذکر کہاں ہے؟ اس میں تو تکمیلِ بیع بشرط البراءۃ من کل عیب کے بعد تو یہ حق ثابت نہیں مانا گیا......اور شرعاً بھی ثابت نہیں، لیکن تکمیل سے پہلے اس کے عدمِ ثبوت کا ذکر کہاں ہے؟ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

''چونکہ ٹریکٹر عمیل نے بحیثیت وکیل خود خریدا ہے، اور اس کے جملہ مطلوبہ اوصاف سے وہ خود واقف ہے اس لئے جب بینک اس کو ٹریکٹر فروخت کرے گا تو اسے ''جیسا ہے جہاں ہے'' کی بنیاد پر فروخت کرے گا، جسے

فقہی اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ''بیع بشرط البراءۃ من کل عیب'' ہوگی، لہٰذا عمیل بیع کی تکمیل کے بعد کسی عیب کی بنیاد پر بینک کو وہ ٹریکٹر نہیں لوٹا سکے گا۔'' (احسن الفتاوی ٧/١٢٠)

(٨) موجودہ خاکے میں جامد اثاثوں مثلاً مشینری وغیرہ کے اجارے کی صورت میں جو صفقہ فی صفقہ کا اعتراض وارد ہوتا ہے، وہ اسی بنیاد پر ہے کہ اس میں کہیں تو صراحۃً اور کہیں عرفاً یہ بات مشروط ہوتی ہے کہ مستقبل میں یہ چیز عمیل ومستأجر کی ہوگی۔ خواہ بصورت ہبہ ہو یا قلیل ایڈوانس کے عوض میں بصورتِ بیع۔ جبکہ احسن الفتاوی کے خاکے میں اس صورت کا کہیں بھی کوئی ذکر نہیں، وہاں جو صورت لکھی ہوئی ہے اس میں صفقہ فی صفقہ کا اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا۔

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی پوری عبارت ملاحظہ فرمایئے:

''ایسے مواقع پر بنک مشینری خرید کر عمیل کو کرایہ پر دیدے، عموماً اس کا کرایہ مقرر کرنے میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ایک متعین مدت میں کرایہ کے ذریعہ مشینری کی کل لاگت منافع کے ساتھ وصول ہو جائے۔ کرایہ داری کی اس مدت میں مشینری بنک کی ملکیت میں ہوگی اور بنک پر ہی اس کی ذمہ داری ہوگی۔'' (احسن الفتاوی ٧/١٢٣)

(٩) وثیقہ کا اختراع اور اس کی بنیاد پر وقت سے پہلے رقم نکالنے والے کے حصے کو ویٹ کے حساب سے کم میں فروخت کرنے پر مجبور کرنا احسن الفتاوی کے خاکے میں کہاں ہے؟

(١٠) شرعاً صحتِ شرکت ومضاربت کے لئے اپنے رأس المال کے تناسب سے نفع کا معلوم ہونا ضروری ہے، اور یہ موقوف ہے کاروبار کی پوری مدت میں استعمال ہونے والے سرمائے کے معلوم ہونے پر جبکہ بینکوں میں ہر دن بلکہ ہر گھنٹے کا سرمایہ الگ ہوتا ہے۔

اس طرح کے غیر معلوم، بکھرے ہوئے، مجہول سرمائے کا جواز احسن الفتاوی کے خاکے میں کہاں ہے؟

احسن الفتاوی کے خاکے میں کیا ہے؟

(۱) ''نکات متعلقہ مشارکہ'' کے عنوان کے تحت تین صفحات پر مشتمل گیارہ نکات میں بینک کا آگے شرکت ومضاربت پر کاروبار کرنے کی صورتوں کا ذکر ہے۔

جامعۃ الرشید کے احباب بتلائیں کہ بینک نے اس پر آج تک کتنا عمل کیا ہے؟

(۲) احسن الفتاوی کے خاکے میں صفحہ ۱۲۰ تجویز نمبر ۱۵ میں صراحۃً یہ لکھا ہوا ہے کہ عمیل عقدِ وکالت کے وقت جو خریداری کا وعدہ کرتا ہے، وہ صرف یقین دہانی کرانے کے لئے کرتا ہے۔ یہ وعدہ بطور شرط کے نہیں ہوتا، جیسے آج کل کے خاکے میں ہوتا ہے۔

آپ حضرات ہی بتلائیں کہ دونوں وعدوں میں فرق ہے یا نہیں؟

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی پوری عبارت یہ ہے:

''وکالت کا عقد کرتے وقت عمیل بطور وعدہ اس بات کی یقین دہانی کرائے گا کہ جب ٹریکٹر بنک کی ملکیت اور ضمان میں آجائے گا تو وہ یہ ٹریکٹر بنک سے پہلے سے طے شدہ قیمت پر خرید لے گا۔''

(احسن الفتاوی ۷/۱۲۰)

(۳) احسن الفتاوی کے خاکے میں ہے:

''اس نظام کی نگرانی کے لئے ''رقابہ شرعیہ'' کا شعبہ قائم کرنا ناگزیر ہے اس کے بغیر شرعی حدود کی رعایت نہیں ہوسکے گی، یہ شعبہ جو ایسے ماہرین شریعت پر مشتمل ہوگا جن کو تدریس وافتاء کا کم از کم پندرہ سالہ تجربہ ہو،

بنک کے یومیہ معاملات ومعاہدات کا فقہی نقطۂ نظر سے عمیق جائزہ لیگا اور فاسد وباطل معاملات کا سدِّ باب کریگا۔'' (احسن الفتاوی ۷/۱۲۴)

اس عبارت میں حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''رقابہ شرعیہ'' کے لئے ایسے ماہرین شریعت کی شرط لگائی ہے جن کو تدریس وافتاء کا کم از کم پندرہ سالہ تجربہ ہو۔

اب ہم آپ حضرات سے دریافت کرتے ہیں کہ اس وقت ان بینکوں میں ''رقابہ شرعیہ'' کے ارکان اس معیار پر ہیں؟

کتنے شرعی ایڈوائزر ایسے ہیں جن کو اتنا طویل تجربہ حاصل ہے؟

(۴) موجودہ خاکہ میں وکیل کو فوراً خریداری کا پابند بنایا گیا ہے تاخیر کرے گا تو نقصان کا ضامن ہوگا...... یہ احسن الفتاویٰ کے خاکے میں کہاں ہے؟ احسن الفتاویٰ میں تو یہ ہے کہ:

''بینک کے لئے از خود تمام اشیاء کی خریداری براہِ راست مشکل ہے، اس لئے وہ مطلوبہ اشیاء کی خریداری کے لئے خود عمیل کو اپنا وکیل بنادے گا اور یہ عمیل پہلے وہ چیز مثلاً ٹریکٹر بینک کے وکیل کی حیثیت سے خرید کر قبضہ میں لے لے گا اور خریداری کی تکمیل پر بینک کو مطلع کردے گا، کہ میں نے وکالت کی بنیاد پر آپ کے لئے ٹریکٹر خرید کر اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور اب میں وہ ٹریکٹر اپنے لئے خریدنا چاہتا ہوں۔

بینک اس موقع پر وہ ٹریکٹر عمیل کو فروخت کردے گا۔

عمیل کے بحیثیت وکیل خریدنے سے لے کر بینک سے اپنے لئے خریدنے تک کا جو درمیانی وقفہ ہوگا اس میں ٹریکٹر بینک کی ملکیت اور بواسطہ وکیل اس کے تقدیری قبضے میں رہے گا اور بینک کے ضمان میں ہوگا، پھر جب عمیل اور بینک کے درمیان بیع منعقد ہوجائے گی اس وقت ٹریکٹر کا ضمان

عمیل کی طرف منتقل ہوگا۔'' (احسن الفتاوی ۷/ ۱۱۹، ۱۲۰)

نیز اس عبارت میں عمیل کے لئے یہ کہاں لکھا ہے کہ فوراً خریدے ورنہ تاخیر کی صورت میں کسی حد تک نقصان کا ضامن ہوگا؟

﴿۶﴾ عنوان ''اکابر کے فتاوی میں افتاء بمذہب الغیر کی مثالیں'' کے تحت تین چار صفحات میں مذہب غیر پر فتاوی کی متعدد مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ لیکن ہر جگہ ابتلاء عام، ابتلاء شدید اور ضرورت کی قید کا ذکر ہے، جبکہ التزام کی ایسی ضرورت نہیں جس کے لئے خروج عن المذہب کو جائز کہا جائے۔ کیونکہ یہ ضرورت اور ابتلاء عام اِن بینکوں کی پیداوار ہے، ان بینکوں کے وجود سے قبل بلکہ آج بھی موجودہ دور میں تقریباً سارے تاجر ادھار معاملات کرتے ہیں، اور بدوں التزام کرتے ہیں، اور سب کی تجارتیں بحمد اللہ تعالی اس کے بغیر چل بھی رہی ہیں..... معلوم ہوا کہ ایسا ابتلاء اور ضرورت نہیں جس کی خاطر خروج عن المذہب ناگزیر ہو۔

﴿۷﴾ اس اعتراض کہ ''ارباب الاموال کی طرف سے مال بینک کو مکمل حوالے نہیں ہوتا، کیونکہ وہ جب چاہتے ہیں اپنے اموال اکاؤنٹ سے نکال سکتا ہے الخ'' کے جواب میں فرماتے ہیں:

"قال في البدائع تحت فصل في شرائط ركن المضاربة: و منها تسليم رأس المال الى المضارب؛ لأنه أمانة فلا يصح الا بالتسليم و هو التخلية و لا يصح مع بقاء يد الدافع على المال.

(بدائع ۱۳/ ۱۶۷)

اس عبارت میں ''ولا یصح مع بقاء ید الدافع'' والا جملہ تسلیم کی تفسیر ہے جس سے معلوم ہوا کہ ''تسلیم'' جس کا تحقق نفس تخلیہ سے ہوجاتا ہے اس تسلیم کے

تحقق کے لئے جس قسم کے تخلیہ کی ضرورت ہے یہ تخلیہ بقاء ید دافع کے منافی ہے۔ بینکوں میں ارباب الاموال جب رقم جمع کراتے ہیں تو اس بات کا تو کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ ''تخلیہ'' کا تحقق بہرحال ہوجاتا ہے کیونکہ بینک جب چاہے اس رقم کو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے، لہٰذا ارباب الاموال کا ''جب چاہے رقم نکلوانے کی اجازت'' کو ان کے ید کے بقاء کی علامت قرار دینا درست نہیں، کیونکہ تخلیہ و بقاء ید میں اجتماع ممکن نہیں۔ سو ارباب الاموال کے ''جب چاہیں رقم نکلوانے کی اجازت'' کو تخلیہ و تسلیم کے منافی قرار دینے کے بجائے ''جب چاہیں شرکت ختم کرنے کی اجازت'' پر محمول کیا جائے گا اور یہ شرط نہ صرف یہ کہ شرط فاسد نہیں بلکہ مطلق مضاربت اور مطلق عقد شرکت کا عین مقتضی ہے کہ مطلق مضاربت و مطلق شرکت میں جو چاہے جب چاہے عقد ختم کرسکتا ہے۔''

(غیر سودی بینکاری، جامعۃ الرشید ۱۲۴، ۱۲۵)

اَقول:

(۱) حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالی بینک کے خاکے میں تحریر فرماتے ہیں:

''(۱) مشارکہ کے آغاز سے متعلق یہ اصول طے ہوا:

ابتداء میں بینک اپنے عمیل سے یہ وعدہ کرے گا کہ مدّتِ مشارکہ مثلاً چھ ماہ کے دوران وہ مجموعی طور پر کتنی رقم مشارکہ کی بنیاد پر عمیل کو فراہم کریگا جس سے عمیل کو یہ حق حاصل ہوجائے گا کہ وہ طے شدہ مدت کے دوران منظور شدہ رقم کی حد تک وقتاً فوقتاً مختلف رقوم مشارکہ کی بنیاد پر لیتا رہے۔ عمیل کے اس حق کا آغاز اس وقت سے ہوگا جس وقت معاہدہ کی

دستاویزات تیار ہوئیں۔

البتہ نفع ونقصان کی تقسیم کے اعتبار سے عملاً مشارکہ کا آغاز اس وقت سے ہوگا جب پہلی بار وہ عملاً مشارکہ کی بنیاد پر رقم بینک سے نکلوائے گا۔''

(احسن الفتاوی ۷/۱۱۶)

اس عبارت میں مشارکہ کی کل مدت کا ذکر بھی ہے اور مجموعی رقم یعنی کل سرمایہ کی مقدار کا ذکر بھی ہے (مثلاً چھ ماہ کے لئے شرکت ہے اور کل سرمایہ ایک کروڑ ہے، گویا ان چھ ماہ میں کاروبار سے جتنا نفع ہوگا وہ کل رأس المال یعنی ایک کروڑ کے حساب سے تقسیم ہوگا) نیز اس عبارت میں اس کا ذکر بھی ہے کہ کل سرمایہ بینک میں ہوگا اور عمیل وشریک کو معاہدہ کے دستاویزات مکمل ہونے کے بعد مدتِ شرکت میں وقتاً فوقتاً نکلوانے کا حق ہوگا، اور پہلی بار نکلوانے سے شرکت کی مدت شروع ہوگی۔

یہ بات معلوم ہے کہ جو شریک عمل کرتا ہے اس کے پاس دوسرے شرکاء کا مال حکماً مضاربۃً ہوتا ہے...... یہاں بینک گویا رب المال ہے اور عمیل مضارب، اور بینک نے عمیل اور اموال کے درمیان تخلیہ کردیا ہے کہ مدتِ مشارکہ میں جب چاہے رأس المال کی مقدار تک اموال وقتاً فوقتاً نکال سکتا ہے، البتہ باقی ماندہ رقم پر بینک کا ید باقی ہے مثلاً عمیل نے ایک کروڑ رأس المال میں سے دس لاکھ پہلی بار نکال دیئے تو باقی نوے لاکھ بینک رب المال کے قبضہ اور ید میں ہے، جبکہ پہلی بار دس لاکھ نکالتے ہی ایک کروڑ سرمایہ کے تناسب سے کاروبار شروع ہوگیا۔

جامعۃ الرشید کے احباب کے بقول جب بقائے ید اور تخلیہ میں منافات ہے تو ان اکابر مفتیانِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے متفقہ طور پر اس کو جائز کیوں فرمایا؟

(۲) دونوں کے استعمال واستخراج کی اجازت اس انداز سے دینا جیسے کرنٹ اکاؤنٹ

میں ہوتا ہے اور جیسے مُقرِض مقروض سے جب چاہے اپنا قرض طلب کرے، ضرور قوی شبہ پیدا کرتا ہے کہ یہ حقیقی شرکت ومضاربت کی طرح نہیں ہے کیونکہ حقیقی شرکت ومضاربت میں جو مال عمیل اور مضارب کو حوالہ اور تسلیم کیا جاتا ہے، اس میں صاحب مال کو اس قسم کی اجازت نہیں ہوتی کہ جب چاہے اپنا دیا ہوا مال نقد کی صورت میں لے لے۔

(۳) یہ کہنا کہ ''جب چاہیں رقم نکلوانے کی اجازت'' کو ''جب چاہیں شرکت ختم کرنے کی اجازت'' پر محمول کیا جائے گا، درست نہیں۔ کیونکہ شرکت ختم کرنے کا حق اگرچہ شرعاً ہر شریک اور رب المال کو ہے لیکن شریعت نے یہ حق تو ان کو نہیں دیا کہ اپنا حصہ نقد کی صورت میں جب چاہیں لے سکتے ہیں۔

شرکت ختم کرنے کے بعد جب تک عمیل مشترک سامان کو فروخت کرکے سارے اموال کو نقد میں تبدیل نہیں کرے گا، نقد روپے کا مطالبہ جائز نہیں۔

رہی یہ بات کہ یہ اپنا حصہ دوسرے شرکاء اور مضارب کو فروخت کر رہا ہے اس لئے نقد روپے لیتا ہے تو اس کی تفصیل عنوان ''شرکت ومضاربت شروع ہونے کے بعد بعض شرکاء کا بعض یا کل رقم نکلوانا'' کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

﴿۸﴾ ''شرکت ختم کرتے وقت شریک کو ایک خاص قیمت پر اثاثے بیچنے پر مجبور کرنا''

اس عنوان کے تحت ایک اشکال کا جواب دیا گیا ہے۔ پہلے پوری عبارت ملاحظہ فرمایئے پھر ہمارا تبصرہ۔ لکھتے ہیں:

''بعض حضرات کی طرف سے اسلامی بینکوں میں رائج اس شرط کو شرطِ فاسد میں شمار کرکے بینکوں کے معاملات کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اور وہ شرط یہ کہ شرکت ختم کرنے والے کو اس کی مملوکہ اثاثوں میں سے حصہ دینے کے بجائے اسے اپنا مشاع حصہ بیچنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ مملوکہ حصوں کے بیچنے پر جبر والی شرط کو شرطِ فاسد تسلیم کر بھی لیا جائے تو آگے تفصیلاً آرہا ہے کہ شرکت شروطِ فاسدہ سے فاسد نہیں ہوتی لہٰذا یہ شرط ہی لغو ہوگی یعنی شریک شرکت ختم کر کے علیحدہ ہونا چاہے گا تو اسے خیار حاصل ہوگا کہ چاہے تو اپنا مشاع حصہ بیچے چاہے نہ بیچے۔ لیکن اگر وہ اپنی سہولت کیش رقم کی وصولی میں ہی سمجھے اور اثاثے بینک کو فروخت کرنا اپنے لئے اہون سمجھے اور بینک بھی اس پر راضی ہو تو اسے کوئی بھی عین اثاثوں میں سے اپنا حصہ لینے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

اور اگر غور کیا جائے تو ارباب الاموال کے لئے سہولت بھی اسی میں ہے، ورنہ ارباب المال اس مشاع کے عین سے تو بہرحال انتفاع نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں ہزاروں لوگ شریک ہیں نیز اثاثوں کے مشاع حصے کو عام مارکیٹ میں فروخت کرنا اس کے لئے عادۃً ناممکن ہے، لہٰذا اسے یہ حصہ ایسے شخص کے ہاتھوں ہی فروخت کرنا پڑے گا جو ان اثاثوں میں دیگر شرکاء کے ساتھ شریک ہو کر اس کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہو۔ اور انہیں بھی اگر زائد قیمت پر فروخت کرے گا یہ خریدیں گے ہی نہیں کیونکہ ان نئے شرکاء کے لئے کاروبار میں شرکت کی غرض سے ان اثاثوں کی بقدر مشاع حصہ میں شرکت اس زائد قیمت سے کم میں بھی ممکن ہے، کیونکہ بینک کی طرف سے تو ہر ایک کو اجازت ہے کہ جو چاہے جب چاہے اکاؤنٹ کھولکر ان اثاثوں میں اپنے سرمایہ کے تناسب سے شریک ہو جائے۔

اور ان کے سوا کسی دوسرے شخص کو ان اثاثوں میں قطعاً رغبت نہ ہوگی۔ لہٰذا شرکت ختم کرنے والا شخص اپنے مشاع حصے تو بہرحال ایسے شخص کے

ہاتھوں ہی فروخت کر سکے گا جو اس کاروبار کا حصہ دار بننا چاہتا ہو کیونکہ عملی طور پر سہولت کا راستہ اسی میں متعین ہے اور اس کام کے لئے سب سے آسان راستہ اس کے لئے بینک ہی ہے کہ براہ راست بینک کو فروخت کر دے کیونکہ بینک ہی بآسانی یہ حصہ خرید کر اپنے پاس یا آگے اس کاروبار میں شریک ہونے والے کسی دوسرے شخص کو فروخت کر سکتا ہے۔

لہٰذا شرکت ختم کرتے وقت اپنا مشاع حصہ بیچنے کی شرط کو اگر شرطِ فاسد مان بھی لیا جائے تو اولاً تو شرکت/ مضاربت کے عقد پر اس شرط سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ شرکت/ مضاربت ایسی شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہوگی، ثانیاً اس شرط کو لغو مان کر شرکت ختم کرنے والے شریک کو اثاثے بیچنے اور نہ بیچنے دونوں کا اختیار دینے کے نتیجے میں بھی عملی طور پر ہوگا بہرحال وہی جو اس شرط کو معتبر ماننے کے نتیجے میں ہوتا، یعنی شرکت ختم کرنے والے شخص کے لئے ان اثاثوں سے انتفاع کا عملی طور پر بسہولت یہی راستہ متعین رہ جائے گا کہ اسے بینک کی مقرر کردہ قیمت پر بینک کے ہاتھوں فروخت کر دے۔ لہٰذا اس شرط کو بہت زیادہ اہمیت دے کر اس کی بنیاد پر بینکوں کے معاملات کو ناجائز اور حرام کہنا **بصیرتِ فقہیہ** کے قطعاً منافی ہے۔

مزید یہ کہ تنضیض کی صورت میں دیگر ارباب الاموال کی طرح خود اس رب المال کا بھی نقصان ہے جو عقدِ شرکت ختم کرنا چاہتا ہے کیونکہ تنضیض کے بعد یہ اثاثے مارکیٹ میں اونے پونے دام نیلام ہوں گے، جبکہ نیلامی کے مصارف اور اس پر اوقات کے ایک کثیر حصے کا صرف ہونا اور پھر نیلامی

کے انتظامات کی محنت جیسے امور الگ رہے جبکہ شریک سے بینک جب
حصہ خریدتا ہے تو

ا۔ مارکیٹ ویلیو (جو کہ عملاً Book Value ہوتا ہے) پر خریدتا ہے۔

۲۔ بینک اس وقت تک کا نفع بھی رب المال کو اس کی قیمت میں شامل کر کے دیتا ہے اس صورت میں علیحدہ ہونے والے شریک کی طرف سے تخصیص کا مطالبہ اضرار لنفسہ ولغیرہ من الشرکاء کے سواء کچھ نہیں۔ فقہاء نے بعض ایسی صورت میں تقسیم کے مطالبہ کو ناجائز قرار دیا ہے جب شریک کا مقصد اضرار لنفسہ ولغیرہ کے سواء کچھ نہ ہو جیسے کسی چیز کی تقسیم کے بعد اگر انتفاع ممکن نہ ہو تو شریک کا ایسے مشترک مال کے عین میں اپنے حصے کو الگ کرنے کا مطالبہ فقہاء کے نزدیک باطل ہے جیسے کسی چھوٹے سے کمرے میں تین آدمی شریک ہوں اور ان میں سے ایک اپنا حصہ الگ کرنا چاہے، جبکہ سب کو معلوم ہے کہ علیحدگی کے اس مطالبے میں دیگر سب شرکاء کا بھی نقصان ہے اور تقسیم کا مطالبہ کرنے والے خود اس شریک کا بھی''

(غیر سودی بینکاری جامعۃ الرشید ۱۲۶ تا ۱۲۸)

اُقول: عنوان ''شرکت ومضاربت شروع ہونے کے بعد بعض شرکاء کا بعض یا کل رقم نکلوانا'' اور عنوان ''وَیٹیج'' کے تحت ہم اس پر بحث کر چکے ہیں کہ بینک کا یہ شرط لگانا اپنے نفع اور کلائنٹ کو نقصان دینے کے لئے ہے، لیکن یہ عجیب **بصیرت فقہیہ** ہے کہ اتنی واضح اور موٹی سی بات کو بھی نہ سمجھ سکی۔

بدوں تراضی جبراً واکراہاً کسی سے کوئی چیز خریدنا حلال ہے یا حرام؟ قرآن کریم نے ﴿إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾ سورۃ النساء آیت نمبر ۲۹، کی شرط اور قید

کیوں لگائی؟ تمام حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے بیع کی تعریف میں مبادلۃ المال بالمال کے ساتھ بالتراضی کی قید لگائی ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں؟

اس **بصیرت فقہیہ** پر تعجب ہے! روزانہ یہ خلاف شرع بیوع ان نام نہاد اسلامی بینکوں میں کتنی ہوتی ہیں؟ اور یہ حرام کس کے پاس انتہاءً جاتا ہے؟ اس حرام سے مسلمان کو بچنا لازم ہے یا نہیں؟ اور بچنے کی صورت کیا ہے؟ رفقاء احباب ہی وہ صورت مسلمانوں کو بتلائیں!!!

نیز یہ کہنا کہ:

''جبکہ شریک سے بینک جب حصہ خریدتا ہے تو

ا۔ مارکیٹ ویلیو (جو کہ عملاً Book Value ہوتا ہے) پر خریدتا ہے۔

۲۔ بینک اس وقت تک کا نفع بھی رب المال کو اس کی قیمت میں شامل کر کے دیتا ہے، الخ''(غیر سودی بینکاری جامعۃ الرشید ۱۲۶)

یہ ایک ایسی بات ہے کہ آپ حضرات کے دل بھی اس کو ماننے کے لئے تیار نہ ہونگے، کیونکہ روزانہ اس قسم کے شرکاء جو کلی یا جزوی طور پر شرکت ختم کرتے ہیں، کئی ہوتے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں روزانہ مارکیٹ ویلیو کا حساب کرنا بینک کے لئے ممکن ہے؟ اور کیا آج تک کسی ایک شریک کو یہ بتلایا گیا ہے کہ آپ کے حصے کی مارکیٹ ویلیو کے حساب سے اتنی قیمت بنتی ہے جس کی وجہ سے آپ کو اصل سرمایہ کے ساتھ ساتھ اتنا نفع بھی دیا جا رہا ہے؟

ایک اسلامی نامی بینک منیجر نے تو بندہ کو خود بتلایا کہ زیادہ ویٹ والا اگر جلدی رقم نکلواتا ہے تو ہم قلیل مدت کے ویٹ کے حساب سے نفع کا تعین کر کے زیادہ مدت کے ویٹ سے جو زیادہ نفع اب تک لے چکا ہے وہ بھی کاٹ لیتے ہیں۔ اگرچہ علماء اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ نفع نہیں کاٹتے .... بلکہ اس کے حساب سے اس کا حصہ کم قیمت میں خریدتے ہیں۔

بہر حال ویلیو وغیرہ کی باتیں صرف ہوائی باتیں ہیں، ان پر بینک کے لئے عمل ممکن ہی نہیں۔

الحاصل یہ شرط بینک نے خالص اپنے نفع اور کلائنٹس کا خون چوسنے کے لئے لگائی ہے۔

احباب جامعۃ الرشید و دیگر مجوزین حضرات ان بینکوں سے یہ ناجائز شرط ختم کروائیں، کیونکہ عام لوگ تو یہ نہیں سمجھتے کہ یہ شرط لغو ہے اور ہم دوسرے کو بھی اپنا حصہ بیچ سکتے ہیں، اس لئے اس شرط کے دباؤ میں کلائنٹ اپنے آپ کو مجبور سمجھتے ہوئے بیچتا ہے اور جن کو لغو ہونے کا علم بھی ہے وہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ شرط شرعاً لغو ہے اور بینک نہ تو شریعت کا پابند ہے، اور نہ علماء کی ہر وہ شرعی بات جس میں بینک کا نقصان ہو، ماننے کا ذمہ دار ہے، (ورنہ رفقاء دار الافتاء جامعۃ الرشید ناجائز اور لغو شرائط سے بینک کو پاک کرنے کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے بینک کو یہ مسئلہ بتائیں کہ یہ شرط لغو اور ناجائز ہے اس کو ختم کر دیا جائے، پھر دیکھیں کہ بینک اس کو مانتا ہے یا نہیں؟) اس لئے یہ لوگ بھی اپنے حصے کو بینک کے ہاتھ فروخت کرنے پر اپنے آپ کو مجبور سمجھتے ہیں۔

بینک اس شرط کو مجوزین حضرات کی وجہ سے چھوڑ کر اپنا نقصان نہیں کر سکتا، وہ جانتا ہے کہ اس شرط کے راز تک اگرچہ مجوزین حضرات کی بصیرتِ فقہیہ نہیں پہنچ پائی لیکن وہ (بینک) تو خوب سمجھتا ہے کہ اس شرط سے دستبردار ہونے کی صورت میں اس کا بہت بڑا نقصان ہے، کیونکہ مثلاً وہ شخص جس نے دس لاکھ روپے پر دس سال مدت کے ویٹ سے پانچ سال تک نفع لیا ہے اگر پانچ سال کے بعد کسی دوسرے پانچ سال تک دس لاکھ روپے رکھنے والے کے ہاتھ اپنا حصہ فروخت کرے گا تو اس کو دس سالہ ویٹ کے حساب سے زیادہ نفع ملے گا، بینک اس شرط کی وجہ سے نکلنے والے یعنی حصہ فروخت کرنے والے سے بھی زیادہ لیا ہوا نفع واپس کر کے خود لے لیتا ہے اور دوسرے کے لئے پنج سالہ ویٹ کے حساب سے نفع کا تعین کر کے اس کو دس سالہ ویٹ کے حساب سے زیادہ نفع سے محروم کر کے قلیل نفع پر مجبور کر دیتا ہے، تاکہ بینک کو زیادہ نفع ملے اور کلائنٹ کو کم۔ اس طرح اس شرط کے ذریعے سے دونوں کا خون چوستا ہے۔

تنبیہ: صرف اس کہنے سے کہ یہ شرط شرعاً لغو اور فاسد ہے اور اس سے شرکت و مضاربت پر کوئی اثر نہیں پڑتا (اگرچہ بینک اس کے ساتھ شرطِ صحیح کا معاملہ کرتا ہو) حضرات مجوزین علماء کرام بری الذمہ ہو جائیں گے؟ اور کیا اس قسم کی شرائط کا مشورہ دینا ان کے لئے جائز ہے؟

حضرات مجوزین علماء کرام کے ذمہ لازم ہے کہ نہ تو ایسی لغو اور فاسد شروط کا بینک کو مشورہ دیں اور اگر بینک ایسی شرائط پر مُصر ہو تو بھی یہ حضرات اپنی شرعی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے ایسی شرائط کے نفاذ اور وجود کا راستہ روکیں، ورنہ ایسے بینکوں سے برائت کا اعلان کر دیں نہ کہ ان کے دفاع پر کمر بستہ ہوں۔

حضرت مولانا مفتی مختار الدین شاہ صاحب کی کتاب ''بلاسود بینکاری'' پر تبصرہ

حضرت مولانا مفتی سید مختار الدین صاحب مدظلہ کی کتاب ''بلاسود بینکاری'' میں کیا ہے؟ اور حقیقت کیا ہے؟

اس سلسلے میں گذارش ہے کہ درج ذیل امور پر غور کیجئے اور خود حضرت مفتی صاحب کی دیانت، تحقیق اور اصول شرعیہ کی پاسداری کا اندازہ لگایئے، اور فیصلہ کیجئے کہ یہ کتاب دیانت پر مبنی ہے یا نہیں؟ اس میں محقق اور مدلل گفتگو ہے یا اس کے خلاف؟ اس میں اصول شرعیہ کا لحاظ رکھا گیا ہے یا ان کو پامال کیا گیا ہے؟

(۱) کتاب ''بلاسود بینکاری'' میں اخباری بیانات جو اکثر غیر مصدقہ ہوتے ہیں، سے یہ تأثر دیا گیا ہے کہ اسلامی بینکاری کا جو خاکہ حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہ نے تیار کیا ہے یہود و نصاریٰ کو وہ قطعاً قابلِ تحمل نہیں۔ جبکہ یہ تأثر حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ اسلامی نامی بینکاری کے خاکے اور ڈھانچے کا موجدِ اول کون ہے؟

ذیل میں اس کا جواب مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب زید مجدہم کی تحریر سے ظاہر ہے کہ وہ یہودی ہے۔

لہٰذا ان کو اس سے چڑ کیوں ہوگی؟ وہ مجوزین ومُرَوّجین سے ناراض کیوں ہونگے؟

نیز اگر یہ مروجہ اسلامی نامی بینکاری نظام ان کے مقاصد سے متصادم ہوتا تو یہود و نصاریٰ کے ممالک میں ان کی کثرت نہ ہوتی۔ یہود و نصاریٰ اپنے بینکوں میں اس کے ونڈوز نہ کھلواتے۔ اپنے ملکوں میں ان بینکوں کو اجازت نہ دیتے۔

''جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن'' سے شائع ہونے والی کتاب میں لکھا ہوا ہے:

اہلِ مغرب اسلامی بینکاری واسلامی معاشیات کو ہاتھوں ہاتھ اپنے ہاں فروغ دے رہے ہیں، روایتی بینک بھی اپنے ہاں ایک اسلامی کاونٹر (Islamic Windows) کھول رہے ہیں خود حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم کا بیان ہے کہ اسلامی طریقہائے تمویل (Modes of Financing) پر آئی، ایم، ایف اور ''ورلڈ بینک'' کے تحت بھی باقاعدہ ریسرچ ہورہی ہے اور ان میں سے بعض کی تائید میں مغربی مصنفین کے مقالات بھی آرہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اہلِ مغرب کو پورے اسلام میں صرف مروجہ طرقِ تمویل (Financing Modes) ہی کیوں اچھے لگتے ہیں؟ کیا اسے اسلامی بینکاری کی نمایاں کامیابی کہنا چاہئے کہ اسے مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم بھرپور دلچسپی کے ساتھ رواج دے رہے ہیں یا سرمایہ داری تقاضوں کی حامل بینکاری؟

حیرت کی بات یہ ہے کہ غیر مسلم ملک ''سنگاپور'' کراچی شہر جتنا ملک بھی نہیں ہے اور ''انڈونیشیاء'' مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک ہے مروجہ اسلامی بینکاری سنگاپور میں زیادہ اور انڈونیشیاء میں کم ہیں۔ (مروجہ اسلامی بینکاری ۸۸،۸۹)

برادرمن! یہودی لابی تو حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب سے بہت خوش ہے کہ ہمارا مرتّب کیا ہوا وہ خاکہ جس کو دوسرے علماءِ حق نے رد کیا ہے، آپ نے اس کو خوب پروان چڑھایا۔

حقیقت کیا ہے؟

اصل حقیقت کو علماء کرام کی درج ذیل وزنی، جاندار اور چشم کشا تحریر میں ملاحظہ فرمایئے۔

یہ تحریر برطانیہ کے محقق اور متدین علماء کرام نے حضرت مفتی حبیب اللہ صاحب زید مجدہم کو ارسال کی ہے۔

۱

﴿برطانیہ سے مقتدر علماء کرام کی تحریر بنام مفتی حبیب اللہ صاحب﴾

از یعقوب احمد مفتاحی، لندن

باسمہ تعالیٰ !

محترم المقام حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ :

بعد سلام مسنونہ خیریتِ طرفین بدرگاہِ ایزدی نیک مطلوب، بندہ عرصہ دراز سے ''اسلامک فائنانس'' کے حوالے سے پریشانی میں تھا کہ مفتی تقی عثمانی صاحب کی رائے کے بالمقابل ''شرعی رائے وفیصلہ'' کا اظہار ہمارے علماء ومفتیانِ کرام کی طرف سے کیوں نہیں ہو رہا ہے جبکہ مفتی صاحب کی ذاتی رائے سے نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں اور خصوصاً برطانیہ میں غلط فائدہ اٹھا کر سودی کاروبار کو ''اسلامک حلال فائنانس'' کا نام دے کر سود کو حلال کیا جارہا ہے۔

الحمدللہ گذشتہ کل امیر جماعتِ حزب العلماء یو کے حضرت مولانا موسیٰ کرماڈی صاحب نے مجھے آپ مدظلہ کی کتاب ''تکملۃ الرد الفقہی ......'' عطاء فرمائی، جسے کل ہی مکمل پڑھ لی اور دل کی گہرائیوں سے حضرت کے کاوشوں کی مقبولیت کے لئے دعائیں نکلیں کہ آپ نے قرآن و نبی الخاتم ﷺ وفقہاءِ امت کا حق ادا کر دیا، فجزاک اللہ خیر الجزاء واحسن الجزاء منھم ومن امۃ المسلمین خصوصاً من علماء الدین۔

بندہ کی ''اسلامک فائنانس'' کے حوالے سے پریشانی کی وجہ کے متعلق دو واقعات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:

کچھ سالوں سے یہاں یورپ میں خصوصاً برطانیہ میں ''حلال بینکنگ'' کے نام سے نہ صرف متدین مسلمانوں نے بلکہ غیر برطانوی اداروں نے بھی اس مہم کو ہوا دی، معلوم نہیں

۲

پسِ پردہ کیا محرکات تھے؟ وہ سمجھ سے اس وقت بالاتر تھے، مگر اس وقت اس حوالے سے یہاں کی دینی شخصیات خصوصاً وہ علماء جو ملکی سطح پر تنظیمی طور پر محرک تھے ان میں اس حوالے سے اس کی صحت اور سود سے پاک ہونے پر مطمئن نہ تھے اور نہ اب ہیں۔

ایسا ہی ایک واقعہ خود مجھے بھی پیش آیا اور وہ یہ ہوا کہ قطر میں مرکز کے حوالے سے ایک گروہ کے نمائندہ نے برطانیہ بھر میں مخصوص جگہوں کے دورے کر کے مقامی مسلم نمائندوں سے ملاقات کی جس میں وہ مجھے بھی ملا اور مقامی مسلمانوں کے ساتھ اس سے ہماری ملاقات وسوال جواب ہوئے، یہ اجلاس انگلینڈ کے لنکا شائر ضلع کی سطح پر بلیکرن میں میرے توسط سے ہوا، اس اجلاس کے حوالے سے یہ بات بڑی تعجب خیز تھی کہ ''اسلامک فائنانس'' کے متعلق قطری مرکز کا ''امریکن غیر مسلم فائنانس'' مسلمانوں سے مخاطب تھا وہ خود کو اسلامیات میں ڈاکٹریٹ کا حوالہ دے رہا تھا اسے اس وقت سخت شرمندگی اٹھانی پڑی جب ایک متدین شخص نے بحث ومباحثہ کے درمیان اس سے کہا کہ جب ''تو اسلام کے حوالے سے اتنے جذبات اور حلال اور حرام کی بات کرتا ہے تو اسلام قبول کیوں نہیں کر لیتا؟''

اس اجلاس کے بعد خود اس نے اور اس کے ایریا علاقے کے غیر مسلم گورے نمائندہ نے بارہا مجھ سے رابطے کئے مگر میں نے انھیں اپوئنمنٹ نہیں دیا۔ اس کے بعد جب برطانیہ میں مارگریٹ تھیچر کی کنزرویٹو پارٹی کو شکست دے کر لیبر حکومت قائم ہوئی تو برطانوی وزیرِ اعظم بلئیر نے برطانوی مسلم نمائندوں کو برطانوی تاریخ میں جہاں پہلی مرتبہ...... پارلیمنٹ میں مدعو کیا وہیں کامن ویلتھ انسٹیٹیوٹ میں خود آکر ملکران کے مسائل سنے اور وعدے کئے۔

تو اس کامن ویلتھ کے اجلاسِ مذکور میں ''قطری مرکز'' کا وہ گورا نمائندہ بھی موجود تھا اس نے جب مجھے پہچان لیا تو دوسرے ساتھیوں کے سامنے وہ خود ہی میرا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگا کہ یہ شخص سخت جان ہے اس نے مجھے بار بار کی کوششوں کے باوجود ملنے کا وقت نہ دیا جس پر میں نے ساتھیوں کے سامنے ہی کہہ دیا کہ ''آپ جس حلال اسلامک فائنانس کے نام

۳ ۳

سے مجھے ڈائیرکٹر بنانا چاہتے تھے اسے میں خود یقین کی حد تک حلال نہیں جانتا تھا تو پھر کیسے میں آپ سے ملوں اور گناہ میں ملوث ہوں؟ اور دوسروں کو بھی ملوث کروں؟''

بہر حال مختصر یہ کہ عربوں کی یورپ خصوصاً امریکہ سے اپنے اربوں کھربوں کی دولت کو باہر نکالنے کے حوالے سے جو طوفانِ ربانی آیا اس میں برطانیہ نہ صرف عمومی سطح پر بلکہ خود حکومت بھی اس میدان میں دکھائی دینے لگی کہ وہ مسلمانوں کو''حلال بینکنگ وحلال مارگیج'' دینے کے حق میں ہے اس ضمن میں یہ ہوا کہ اچانک حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب کے برطانیہ کے مخصوص دورے شروع ہوئے اور آپ نے''برطانوی حلال فائنانس''پروگرام کو بہت زیادہ تقویت دینی شروع کردی اور اس پر پورا زور لگادیا۔

ہم نے ذرائع سے مفتی صاحب کو انجانے طور پر اس غیر اسلامی حرکت اور سود کو حلال کرنے کی مہم جوئی سے رکنے اور اس کے مضمرات و دلائل سے باخبر کیا حتی کے آج سے دو سال پہلے غالباً ۲۰۰۴ء کے فروری میں مفتی صاحب اسی ایک مخصوص دورۂ تبلیغ پر............ لندن میں ایک ہوٹل میں مقیم تھے اللہ کی شان کہ خود ان کی طرف سے بندہ سے ملنے کا پیغام آیا تو بجائے اس کے آپ میرے پاس تشریف لائیں میں اور امیرِ جماعت حضرت مولانا موسی کرماڈی صاحب دونوں دوسرے روز ہوٹل چلے گئے جہاں تقریباً دو گھنٹوں سے زیادہ ملاقات رہی۔

یہاں یہ بھی بتادوں کہ یہ ملاقات اور اس کی خواہش مفتی صاحب کی طرف سے ہمارے اوقاتِ عشاء و فجر کی نمازوں کے سال بھر کے برطانوی مشاہدات اور اس کی تفصیلات کے متعلق دو بدو جاننے کے حوالے سے تھی کیونکہ ڈگریوں پر(۱۵، ۱۸)اوقاتِ نماز کے داعی حضرات نے مفتی صاحب کو اپنے ایک اجلاس میں فیصلہ کے لئے مجبور کیا تھا......اور چونکہ موصوف ۱۸ ڈگری کے قائل تھے وہ سمجھے کے یہی فیصلہ کردیں گے مگر اللہ کا کرنا کہ اس حوالے سے ہماری کتاب''برطانیہ میں عشاء کا صحیح وقت'' کا پہلے ہی مطالعہ کر چکے تھے جیسے کہ

۴

موصوف نے مجھے اس ملاقات میں بتلایا کہ میں نے آپ کی کتاب کو اول تا آخر پڑھا ہے، بہر حال اوقات کے حوالے سے آج تک آپ نے اپنے فیصلے کو ظاہر نہیں کیا ہے جبکہ بندہ نے اپنی دوسری انگلش کتاب (فجر اور عشاء کے اوقات، برطانیہ میں) کا حوالہ بھی دیا اور بھیجا بھی جو، اردو کتاب سے مختلف انداز و غیر مسلم ماہرین کے حوالوں سے درجات کے اوقات اور مشاہداتی اوقات میں فرق کو ثابت کرتے ہوئے درجاتی اوقات کو غلط بتلانے سے بھرپور ہے

بہر حال اوقات کے حوالے سے جب بات پوری ہوگئی تو میں نے اسی حلال اسلامک فائنانس کے متعلق بات چھیڑ دی اور مذکورہ قطری واقعہ اور میرا ان تمام طریقوں پر عدمِ اطمینان کا کھل کر اظہار کیا، کیونکہ مفتی صاحب برطانیہ و یورپ میں انجانے طور پر (شاید) اس سے قائدانہ منسلک تھے، آپ نے محسوس کرلیا اور حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے جو جواب آپ نے دیا وہ قابلِ اعتراف ہے اور جس نام اور تجارت کے طریقوں سے اسلامک حلال فائنانس کے نام سے جو بھی اقدامات ہو رہے ہیں بلکہ اب تو اسلامک بینک بھی مفتی صاحب کی کاوشوں کے نتیجے میں لندن میں کھل چکی ہے اور اب اس کی شاخوں کے ملک بھر میں کھلنے کے دن قریب ہیں اور ساتھ ہی برطانوی بینکز بھی اسلامک سیل کے نام سے اپنے بینکوں میں دفتر کھول چکے ہیں، زیادہ تر آپ ہی کے مرہون ہیں اور شاید فکر مند بھی ہیں، بہر حال آپ نے جواباً فرمایا: پہلے تو یہاں اسلامک فائنانس کی بات کرنا بھی ناممکن تھا چلو اتنا تو ہوا کہ حکومت نے............تو یہ چیزیں بھی دور ہو جائیں گی''(اس سے ثابت ہوا کہ موصوف خود بھی مطمئن نہیں) اس پر میں مزید تو کیا لکھوں آپ نے اپنی کتاب میں کافی تفصیل سے ان کے اس قسم کے مختصر جوابات و حکمتوں کا جال توڑا ہے۔

بہر حال موصوف نے نہ صرف اسلامک فائنانس میں اپنی ذاتی رائے کا دخل دیا اور اب پانی سر چڑھ جانے کے بعد اس سے واپسی کے کوئی معنی نہیں کہ لوگ گناہ میں ملوث تو ہو رہے ہیں مگر اس طرح اسلامی نصوص و قوانین کی دھجیاں بھی بکھیری جا رہی ہیں اور اب مفتی

۵

صاحب کے واپسی کی طرح ان تاجروں کی واپسی خود موصوف کے دخل کے بعد بھی ناممکن ہو چکی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

جیسے اسلامک فائنانس کا مسئلہ ہے وہیں اوقاتِ نماز کے علاوہ رویتِ ہلال کا مسئلہ بھی ہے کہ موصوف اب تک خود والدِ گرامی حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بھی برخلاف اسلامی نص و چودہ سو سالہ اسلامی رویتِ ہلال مسئلہ کو ۱۸ ٹرو ویٹری کے نیومون مفروضہ کے تابع بناتے چلے آتے تھے، میری اس ملاقات میں ہم نے اس سلسلے میں بھی انھیں باخبر کیا اور اوقات کے مشاہدات کی طرح آئینی رویتِ ہلال کے رصد گاہی حسابات کے مخالف واقعات کی اور خود میں نے اپنے ذاتی مشاہدہ رویتِ ہلال بموقع حج مدینہ منورہ میں مسجدِ نبوی سے ہونے کی شہادت کا ذکر بھی شامل تھا جن کی مکمل تفصیل ایک خط کی شکل میں کئی صفحات پر مشتمل میں نے ملاقات سے ایک ماہ بعد روانہ بھی کر دی تھی جیسے کہ آپ کی چاہت تھی الحمد للہ ابھی دو ماہ ہوئے گلاسکو کے سائل کے جواب میں ایک فتویٰ رویتِ ہلال کے سلسلے میں موصوف نے دیا ہے جس میں اسے نیومون سے مشروط کرنے کا انکار اور شہادت کو قبول کرنے کا ذکر ہے جس سے جدید نامی ترقیات سے مرعوب لوگوں کے لئے واپسی کا عندیہ ہے مگر موصوف نے افسوس کہ اس کے باوجود لکھا ہے کہ نیومون مفروضہ وسوالات و جوابات رویتِ ہلال کا مستقل ایک مسئلہ ہے لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

نیومون مفروضہ کوئی نئی بات تو نہیں؟ کیونکہ آپ ﷺ کے زمانے میں بھی تو یہ علوم تھے اور یہود اسی پر تو عمل کرتے تھے اور اسی لئے تو آپ ﷺ نے ان کے خلاف کرتے ہوئے قیامت تک کے لئے فرمایا کہ نحن امة امية لا نكتب ولا نحسب (الحدیث) تو اب یہ اجتہادی مسئلہ کیسے بن گیا؟ جبکہ ۱۴ سو سالوں تک فقہاءِ امت نے اجماعی طور پر اسے اجتہادی نہ بنایا حالانکہ خیر القرون کے بعد متصلاً ہی یونانی و ہندی فلسفہ کی کتابوں کے تراجم عربی میں ہوئے اور فلکیات خصوصاً رویتِ ہلال اور اوقاتِ نماز پر بحث و مباحثہ کا غیر ضروری و غیر

۶

اسلامی سلسلہ تب سے شروع ہو کر اب تک چلا آ رہا تھا جس میں خصوصاً سلاطین و امراء کا عمل دخل کارگر رہتا چلا آیا اس لئے موصوف نامِ نامی فکری سنگین کوتاہیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں اور کھل کر دینِ حنیف پر نہیں بولتے خصوصاً یہ مسائل۔

آخر میں الحمد للہ آپ کی کوششوں پر مبارک باد کے حوالہ سے یہ چند باتیں لکھی گئی ہیں ساتھ ہی ''برطانیہ میں عشاء کا صحیح وقت'' اردو روانہ ہے اور یہ ابھی چھپی نہیں ہے اگرچہ سی ڈی پر ہے اگر ضرورت ہو تو روانہ کر دوں گا، دعوات میں یاد فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ مفتی تقی صاحب کو ہمت عطاء فرمائے کہ وہ ان مسائل کو کھل کر مبنی برحق بیان کر دیں تا کہ امت کا وبال و بگاڑ سے تحفظ ہو، آمین

فقط

والسلام یعقوب احمد مفتاحی

ناظم حزب العلماء یوکے و مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی، برطانیہ (جمعیۃ العلماء، حزب العلماء یوکے)

مورخہ ۲۷/ رجب ۱۴۲۷ھ ۲۱/ اگست ۲۰۰۶ء بروز دوشنبہ

نوٹ: اس تحریر سے متعلق مزید معلومات شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب زید مجدہم سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

(۲) کتاب ''بلا سود بینکاری'' میں علماء حق کے کئی ثقہ اور متدین مفتیان کرام دام اقبالہم پر بہت بڑا الزام لگایا گیا ہے۔ ان کے خلاف دو آیتیں اور ایک حدیث پیش کر کے ان کا مصداق ان پاکیزہ نفوس کو ٹھہرایا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''لیکن معلوم نہیں کہ اس پاکیزہ جماعت کے بعض با اثر افراد کو کیا نظر لگ گئی کہ ان کی طرف سے ایک بڑی کمزوری اور غیر متوازن رویہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک تو یہ حضرات قرآن و حدیث کی واضح نصوص

﴿ ولا تقف ما ليس لك به علم ان السمع و البصر و الفؤاد كل أولئك كان عنه مسئولا ﴾

۷

اورجس بات کی تجھے علم (اور تحقیق) نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ (بلکہ آنکھوں کانوں اورعقل سے کام لے کر صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرو) بے شک کان آنکھ اور دل ہر ایک سے باز پرس ہوگی۔(اسراء:۳۶)

﴿ یا أیها الذین آمنوا ان جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا أن تصیبوا قوما بجهالة فتصبحوا علی ما فعلتم ندمین ﴾

اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرو۔(حجرات:۶)

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے

كفى بالمرء كذبا أن يحدث بكل ما سمع

آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو (بغیر تحقیق کے) بیان کرے۔(حدیث)

ان واضح نصوص کے باوجود سنی سنائی باتوں پر عمل کر کے علماء ومشائخ کی تحقیر وتذلیل جیسے بدترین گناہ اور جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

دوسری کمزوری ان کی یہ ہے کہ یہ حضرات صرف اختلافی مسائل میں حد سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ معمولی نوعیت کے اختلافی مسائل کو بڑھا چڑھا کر ان کو کفر وشرک وغیرہ جیسا سنگین مسئلہ بنا دیتے ہیں پھر اس کے پردہ میں اپنے مسلک کے ان علماء ومشائخ کی جن سے اللہ تعالیٰ کوئی دینی کام لے رہا ہے تحقیر وتذلیل اور تنقیص کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔خصوصی اور عوامی تقریبات اور اجتماعات میں ان کو نشانہ بناتے ہیں اور جس مسئلہ میں کسی شخص سے اختلاف کرتے ہیں تو وہ اپنی رائے کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ گویا ان کی بات اور رائے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی کی بات

۳۸

اور حکم ہے اور جو اس کو قبول نہ کرے وہ گویا اسلام سے خارج ہے۔اس کے بارے میں بندہ کے پاس کافی شواہد موجود ہیں جن کا ذکر کرنا یہاں مناسب نہیں۔'' (بلاسود بینکاری ۴۰، ۴۱)

اُقول: اس عبارت میں دو الزام لگائے گئے ہیں۔

ایک الزام یہ کہ ان علماء ربانیین کے رویے کو غیر متوازن کہہ کر ان کو بدترین گناہ اور جرم کا مرتکب قرار دیا ہے۔

دوسرا الزام یہ کہ اختلافی مسائل میں یہ علماء ربانیین حد سے تجاوز کرتے ہیں اور معمولی نوعیت کے مسائل کو کسی نیک پاک طینت عالم دین پر الزام لگانے کی خاطر بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔

حقیقت کیا ہے؟

موجودہ اسلامی نامی بینکوں کے خلاف فتوی دینے والوں میں ایسے جید اور پاک طینت علمائے کرام دامت برکاتہم شامل ہیں جن کے رویے کو غیر متوازن کہنا، ثالث کو اس فیصلہ پر مجبور کرتا ہے کہ خود لکھنے والا متفقہ فتوی اور بنوری ٹاؤن سے شائع ہونے والی کتاب دیکھ کر بیچارہ غیر متوازن رویے کا شکار ہو گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان جید علماء کرام کی بینکنگ کے سلسلے میں جو مجالس قائم ہوئیں، صرف ان کے دوران ہی نہیں بلکہ اس سے بھی پہلے اپنی اپنی جگہ سالوں سے اپنی تحقیقات کی روشنی میں موجودہ بینکاری نظام کو خلافِ شرع سمجھتے رہے ہیں۔

نیز جیسے چائے پانی کے عنوان سے رشوت خوری کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ایسے ہی اسلام کے نام پر حرام خوری اور ربا کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرنا (خواہ غیر اختیاری اور اجتہادی طور پر ہی کیوں نہ ہو) بھی کوئی معمولی مسئلہ نہیں، بلکہ امت کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے مقابل میدانِ جنگ میں لا کھڑا کرنا ہے۔ایسے اکبر الکبائر کو معمولی سمجھنا حقیقت کا

۹

انکار ہے، اور اُن درجنوں نصوص قطعیہ سے نظریں چرانا ہے جن میں ربا، حرام خوری اور بیوع فاسدہ کی مذمت، شناعت اور حرمت وارد ہوئی ہے۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: لیکن معلوم نہیں کہ اس پاکیزہ جماعت الخ

جب معلوم نہیں تو الزام کیوں لگایا؟ فتوی دینے والے اسی ملک میں رہتے ہیں ان سے جا کر معلوم کر لیتے۔ دوسروں کو تو آیت ﴿ولا تقف ما لیس لک بہ علم﴾ کا الزام دیا جا رہا ہے کہ بدوں علم اور تحقیق کے فتوی دیتے ہیں جبکہ خود اقرار فرما رہے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں۔ تو بدوں علم و تحقیق کے رسالہ کیوں لکھا گیا؟ کیا یہ رسالہ لکھنا کوئی فرض تھا؟

(۳) اس کتاب میں کتنے نیک اور متدین علماء کرام دامت برکاتہم کے اخلاص پر حملہ کیا گیا ہے...... لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ فقہی مسائل میں فتاوی اور آراء کا اختلاف فطری بھی ہے اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں بلکہ ہر دور میں اختلافات پیدا ہوئے ہیں اور یہ اختلاف کوئی نقصان دہ بھی نہیں بلکہ اگر یہ اختلاف دیانت اور اخلاص پر مبنی حدودِ اعتدال میں ہو تو یہ یقیناً امت کے لئے باعث خیر و رحمت ہے۔ لیکن جب اختلاف کا مقصد عناد اور دوسرے کی توہین و تحقیر ہو یا اس اختلاف کا مقصد اس فانی دنیا کی مال و عزت کا حصول ہو یا اپنی بات اور رائے پر حد سے زیادہ اصرار اور منوانے اور دوسروں کی بات نہ ماننے کا جذبہ کارفرما ہو تو ایسا اختلاف یقیناً شر و فساد اور افتراق و انتشار کا سبب بنتا ہے۔ اسلاف امت نے اختلافِ رائے کو اپنی حدود میں رکھا ان میں اخلاص و للّٰہیت تھی اور ان کا مقصد تحقیق حق اور طلب ثواب تھا ان کے اختلاف سے امت کے لئے جو خیر کے پہلو پیدا ہوئے اس پر صدیوں کی تاریخ گواہ ہے۔ (بلاسود بینکاری ۴۲)

۳۳۰

اَقول: اس عبارت میں اہل حق کے کتنے ایسے مفتیان کرام (جن کی دیانت، اخلاص اور علم پر لوگوں کو شاید کہ حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے علم و دیانت سے زیادہ اعتماد ہو) پر عدمِ دیانت اور عدمِ اخلاص کی تہمت لگائی گئی ہے۔ ایسے اکابر پر عدمِ دیانت اور عدمِ اخلاص کی تہمت لگانا کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ نیز ان کے دل کس خوردبین اور دوربین سے نظر آئے کہ یہ دیانت اور اخلاص سے خالی ہیں؟

حقیقت کیا ہے؟

اصل حقیقت یہ ہے کہ ان مانعین حضرات میں سے کتنے حضرات پیکر اخلاص و دیانت ہیں اور حدیث '' ظنوا بالمؤمنین خیرا '' کے پیش نظر ہمیں ان سے اچھے گمان کا حکم ہے۔ انہوں نے بینک کے خلاف فتوی یہ جاننے کے باوجود کہ اس فتوی کے بعد ہم پر کیسے کیسے لوگ، اور کہاں کہاں سے اور کن کن جملوں سے اعتراضات کی بوچھاڑ کریں گے!!! لیکن شرعی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اور صرف اللہ تعالی کی خوشنودی کو مدنظر رکھتے ہوئے پوری دیانتداری کے ساتھ ان حضرات نے فتوی دیا۔

(۴) بلاسود بینکاری میں لکھا گیا ہے:

''اب ''متفقہ فتوی'' نامی فتوی کو دیکھئے کہ وہ کس قدر غیر متوازن اور غیر معتدل ہے اور اس فتوی کے پس منظر کو بھی دیکھا جائے تو ایک انصاف پسند مسلمان کی تشویش و افسوس اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

کیونکہ ایک تو اسلامی بینکاری کا مسئلہ ایک حساس مسئلہ ہے۔ اس میں اخباری اور صحافیانہ انداز میں فتوے شائع کرنا...... الخ'' (بلاسود بینکاری ۶۰)

اَقول: جناب نے ایک فریق کی تحریر اور بات سن کر پس منظر کو متعین کر لیا۔ کاش کہ آپ فتوی دینے والوں سے بھی اس کا پس منظر معلوم کر لیتے یا کم از کم بنوری ٹاؤن سے شائع ہونے والی کتاب ''مروجہ اسلامی بینکاری'' کو بنظر انصاف دیکھتے، تو اس فتوی کو کبھی غیر

متوازن اور غیر معتدل نہ کہتے۔

کیا آپ کی نظر میں جامعہ اشرفیہ لاہور کے مفتی حضرت مولانا حمید اللہ جان صاحب، جامعہ خیر المدارس کے مفتی حضرت مولانا عبداللہ صاحب، جامعہ اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے مفتی حضرت مولانا عبدالمجید دین پوری صاحب، جامعہ اشرفیہ سکھر کے مفتی حضرت مولانا عبدالغفار صاحب، جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ کوئٹہ کے مفتی گل حسن صاحب، مدرسہ تعلیم القرآن دارالافتاء ربانیہ کوئٹہ کے مفتی روزی خان صاحب وغیرہم دامت برکاتہم اندازِ فتویٰ سے کچھ شُد بُد نہیں رکھتے؟ جبکہ ایک زمانے سے ان حضرات کے اکثر اوقات فتویٰ نویسی اور تحقیقات میں صرف ہو رہے ہیں۔

تعجب ہے کہ کس بیباکی کے ساتھ ان اکابر کے فتویٰ کو غیر معتدل، غیر متوازن، اخباری اور صحافیانہ انداز کا فتویٰ کہا گیا ہے؟ کیا کسی فتویٰ کا اخبار میں آنا یہ اس فتویٰ کے صحافیانہ اور اخباری ہونے یعنی مثلِ اخبار غیر مصدقہ ہونے کی علامت ہے؟

حقیقت کیا ہے؟

الحمدللہ اس فتویٰ کے پیچھے دلائل کا انبار ہے جس کو علامہ بنوری ٹاؤن سے شائع ہونے والی کتاب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ نیز زیرِ نظر کتاب میں بھی ان دلائل کی تھوڑی سے جھلک ان شاء اللہ تعالیٰ ملاحظہ فرماسکیں گے۔ البتہ ''بلا سود بینکاری'' نامی اس تحریر کو صحافیانہ اور اخباری انداز کی تحریر کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں اخباری خبریں بطور شہادت اور دلیل کے پیش فرمائی گئی ہیں۔

(۵) آگے لکھتے ہیں:

''اس لئے اس کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر کچھ عرض کرنے کی جسارت پر پیشگی عاجزانہ معذرت کے ساتھ ان علماء و مشائخ سے درخواست کرتا ہوں جنہوں نے بلاسود بینکاری وغیرہ کے

بارے میں غیر متوازن فتویٰ خطابت کے انداز میں دیا ہے اور جنہوں نے اس پر دستخط کئے ہیں کہ وہ اس فتویٰ پر نظرِ ثانی فرمائیں''(بلاسود بینکاری ۶۲)

اَقول: یہ درخواست بے محل ہے۔ کاش آپ ان مانعین حضرات پر بمباری اور مشتمل بر دلائل فتویٰ کی بے حرمتی سے قبل ان حضرات کی خدمت میں تشریف لے جاتے، حقائق معلوم کرتے، اور مل بیٹھ کر غور وفکر کی صورت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تاکہ ایک اتفاقی صورت سامنے آتی جیسے بندہ نے اس زیرِ نظر کتاب کی طباعت سے پہلے اپنی مقدور بھر کوشش کی، جس کی روئیداد بعنوان ''بینکنگ کے مسئلہ پر اجتماعی غور وفکر کی کوشش ناکام کیوں ہوئی؟'' کے تحت ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ اخباری خبروں پر مبنی اور نامناسب فقرے اکابر پر کسنے کے بعد ''درخواست'' کرنا ایک استہزاء برا استہزاء سا معلوم ہوتا ہے۔

﴿ضمیمہ﴾

اسلامی نامی بینکوں میں رقم لگانا، نفع لینا اور ملازمت کرنا وغیرہ ناجائز اور حرام ہے!

کسی مذہب میں بھی جائز اور حلال نہیں

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم . امابعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں : یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَموَالَكُم بَینَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِنكُم.[النساء: ۲۹]

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق (یعنی غیر مباح) طور پر مت کھاؤ لیکن (مباح طور پر ہو مثلاً) کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے واقع ہو (بشرطیکہ اس میں اور بھی شرائطِ شرعیہ ہوں) تو مضائقہ نہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا ہے : أَلَا لَا تَظْلِمُوْا أَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ، رواہ البیھقی فی شعب الایمان و الدارقطنی فی المجتبی.

(المشکوۃ : ۲۵۵)

''خبردار! کسی پر ظلم مت کیا کرو، خبردار! کسی آدمی کا مال اس کے دل کی خوشی کے بغیر ہڑپ کرنا حلال نہیں۔

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے : وعن عمرو بن عوف المزنی عن النبی ﷺ قال : اَلصُّلحُ جَائِزٌ بَینَ المُسلِمِینَ، إِلَّا صُلحاً حَرَّمَ حَلَالاً أَوْ أَحَلَّ حَرَاماً

وَالمُسلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِم إِلَّا شَرطاً حَرَّمَ حَلَالاً أَوْ أَحَلَّ حَرَاماً. رواہ الترمذی وابن ماجہ وأبو داود.(المشکوۃ ص: ۲۵۳، ط:قدیمی)

حضرت عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے ہاں وہ صلح جائز نہیں جو حلال چیز کو حرام یا حرام چیز کو حلال کردے اور مسلمان اپنی شرطوں پر (قائم رہنے والے) ہیں۔ ہاں اس شرط کی پابندی جائز نہیں جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کردے۔

بطور تمہید چند باتیں:

(۱) **بینکنگ کے معاملات کو سمجھنے کے لیے انگریزی دان، ماہرِ معاشیات یا ماہرِ بینکنگ ہونا ہرگز ضروری نہیں** بلکہ محض فقہی مسائل سے واقفیت بھی کافی ہے۔ خود مفتی تقی عثانی صاحب زیدمجدہم نے اپنی کتاب غیرسودی بینکاری میں لکھا ہے:

> ''واقعہ یہ ہے کہ فقہی مسائل چاہے معاشی یا مالی معاملات سے متعلق ہوں ان کا شرعی حکم جاننے یا بتانے کے لیے ایک مفتی کا نہ ماہرِ معاشیات ہونا ضروری ہے نہ بینکنگ کا ماہر ہونا اور نہ انگریزی زبان سے واقف ہونا، البتہ ایک بات جس طرح دوسرے مسائل میں ضروری ہے ان مسائل میں بھی ناگزیر ہے اور وہ یہ کہ جس بات پر وہ کوئی حکم لگارہا ہے اس کی صحیح صورتِ مسئلہ اسے پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہو کیونکہ فتوی کا حکم اسی صورت پر لگتا ہے اور ''الحکم علی الشیء فرع عن تصورہ'' اگر کسی مفتی کے سامنے غلط صورتِ واقعہ بیان کی جائے تو یقیناً اس کا فتوی اسی غلط صورت کے مطابق ہوگا جو نفس الامر کے مطابق نہیں ہوگا''۔
>
> (غیرسودی بینکاری، ص:۵۵)

٥

(٢) خلاف اور اختلاف میں فرق: اگر اقوالِ مختلفہ دلائل پر مبنی ہوں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں اختلاف ہے اور اگر دلائل پر مبنی نہیں ہیں تو جو قول دلیل پر مبنی نہیں ہے یا جس کا قول دلیل پر مبنی نہیں ہے تو کہا جائے گا کہ اس نے خلاف کیا ہے، اختلاف اس کو نہیں کہیں گے۔ اختلاف کی صورت میں ہر ایک کا قول دلیل پر مبنی ہوتا ہے اور خلاف کی صورت میں بعض کے اقوال بغیر دلیل کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح راجح کے مقابلہ میں مرجوح قول بھی خلاف ہوتا ہے۔

چنانچہ ''کشاف اصطلاحات الفنون'' میں اختلاف اور خلاف کے اس فرق کو بایں الفاظ واضح کیا گیا ہے:

الاختلاف لغة ضد الاتفاق قال بعض العلماء ان الاختلاف يستعمل في قول بني على الدليل والخلاف فيما لا دليل عليه كما في بعض حواشي الارشاد ويؤيده مافي غاية التحقيق منه ان القول المرجوح في مقابلة الراجح يقال له خلاف لا اختلاف. ... والحاصل منه ثبوت الضعف في جانب المخالف في الخلاف فانه كمخالفة الاجماع و عدم ضعف جانب في الاختلاف لانه ليس فيه خلاف ما تقرر،انتهى.(كشاف اصطلاحات الفنون ٢/٥٧،ط:دار الكتب العلميه،بيروت)

وقال العلامة المرغيناني رحمه الله تعالى : وفي ما اجتمع عليه الجمهور لايعتبر مخالفة البعض وذلك خلاف وليس باختلاف والمعتبر الاختلاف في الصدر الاول.(الهداية ،كتاب آداب القاضي،فصل في قضاء المرأة ٣/١٤٢ ، ط:شركة علميه)

٣٣٦

اسلامی نامی بینکوں میں اور آج کل کی بعض مروجہ تجارتی کمپنیوں میں بھی اہم مسائل میں اختلاف نہیں بلکہ مجوزین کا خلاف ہے۔ کما سیأتی

(٣) خلاف کے نقصانات میں سے دواہم نقصان یہ ہیں:

(الف) اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ دلیل پر مبنی بات شریعت ہے اور اس کے خلاف بغیر دلیل کے بات کرنا یہ خلافِ شرع بات ہے اور خلافِ شرع بات سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔ اور ہم چونکہ انسان ہیں لہٰذا انسان ہونے کی بنا پر غلط فہمی ہو جاتی ہے لیکن غلط فہمی والا گناہگار نہیں ہوتا، البتہ حقیقت یہی ہے کہ اگر کوئی دیدہ و دانستہ دلیل پر مبنی بات کو چھوڑے گا اور اس کے خلاف کرے گا تو وہ گناہگار ہوگا۔ باقی رہی یہ بات کہ کرنے والا کیسا ہے؟ وہ گنہگار ہوگا یا نہیں؟ تو جیسے کہا جاتا ہے کہ یہ بات کفر ہے، لیکن اس بات کا مرتکب کافر ہے یا نہیں؟ اس میں دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ بعض اوقات تو مرتکب کافر ہوتا ہے، بعض اوقات اس کفر کا مرتکب کافر نہیں ہوتا اور یہ اپنی جگہ پر تفصیلی بحث ہے۔ لہٰذا حقیقت یہی ہے کہ دلیل پر مبنی بات شریعت ہے اور اس کے خلاف کرنا بغیر دلیل کے اور اس کا انکار کرنا خلافِ شرع ہے اور خلافِ شرع امر سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔

(ب) ایک ناجائز کی خاطر کئی ناجائز کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ جب آپ نے دلیل پر مبنی بات کو چھوڑا، اور اس کے خلاف قول کیا، اب اس کو درست کرنے کے لیے کئی ناجائز امور کرنے پڑیں گے۔ مثلاً یہاں بینکوں میں جو شرکت ہے، شرکتِ عنوکیہ، اس کا جواز خلافِ شرع ہے۔ اس کے ارتکاب کے نتیجے میں دوسرے خلافِ شرع امور کا

ے

ارتکاب کیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ نفع نقصان کی تقسیم کا جو طریقہ ہے، جس کو ''یومیہ پیداوار'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے، وہ خلافِ شرع ہے۔ اسی طریقہ پر تقسیم کے ایک اور طریقے کو ''اقرب الی العدل'' کہا گیا ہے، وہ بھی سراسر اصولِ موضوعہ مسلمہ کے خلاف ہے۔

بہرحال حاصل یہ ہے کہ خلاف کے یہ دو اہم نقصان ہیں:

(الف) اللہ تعالی ناراض ہوتے ہیں۔

(ب) ایک ناجائز کو درست کرنے کے لیے کئی ناجائز کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔

(٤) شرکت کی اقسام :

واضح رہے کہ شرکت کی ابتداء دو قسمیں ہیں:

(۱) شرکتِ ملک (۲) شرکتِ عقد

شرکت ملک : دو یا زیادہ آدمیوں کا کسی چیز کا مالک بننا جیسے ایک آدمی مرگیا تو اب اس کی جائیداد میں تمام ورثہ شریک ہیں اور ان کی شرکت شرکتِ ملک ہے۔

شرکت عقد: یعنی تجارتی شرکت جس سے مقصود نفع حاصل کرنا ہو۔

پھر شرکتِ عقد کی چار اقسام ہیں:

(۱) شرکتِ مفاوضہ

(۲) شرکتِ عنان

(۳) شرکتِ تقبل یا شرکتِ صنائع

(۴) شرکتِ وجوہ

شرکت مفاوضہ : دو یا زیادہ آدمی آپس میں شرکت کا معاہدہ کریں اور

سرمایہ، تصرفات اور نفع ونقصان سب میں برابر برابر ہوں، کم زیادہ نہ ہوں اور نفع کی تقسیم بھی سرمائے کے مطابق ہو۔ جیسے زید، بکر اور خالد نے اپنا کل سرمایہ جو کہ ایک ایک لاکھ تھا، جمع کر کے شرکت کی اور یہ طے بھی کیا کہ ہر ایک عمل بھی کرے گا اور ہر ایک کو نفع ونقصان میں ایک تہائی حصہ ملے گا۔ اس میں ہر ایک شریک دوسرے کا وکیل بھی ہوتا ہے اور کفیل (ضامن) بھی۔

شرکت عنان : دو یا زیادہ آدمی آپس میں شرکت کا معاہدہ کریں اور سرمایہ، تصرفات اور نفع ونقصان سب میں کم وبیش ہوں، برابر سرابر نہ ہوں۔ مثلاً زید، عمرو، بکر نے شرکت کی زید کا سرمایہ ایک لاکھ ہے اور عمرو کا دو لاکھ اور بکر کا تین لاکھ، اور نفع بھی اسی تناسب سے طے ہوا کہ بکر کو آدھا نفع ملے گا اور عمرو کو ایک تہائی حصہ ملے گا اور زید کو نفع کا چھٹا حصہ ملے گا۔

شرکت تقبل یا شرکت صنائع: دو یا زیادہ آدمی کسی عمل کی بنیاد پر آپس میں شرکت کرلیں، مثلاً دو درزی یا دو رنگریز آپس میں شریک بن کر لوگوں سے کام لیں اور نفع آپس میں حسبِ معاہدہ تقسیم کرلیں، اس کو شرکتِ ابدان بھی کہتے ہیں۔

شرکت وجوہ: شخصی وجاہت کی بنیاد پر شریک بن کر کاروبار کرنا جیسے دو آدمی، جنہیں سب لوگ جانتے پہچانتے ہوں، شریک بن کر جان پہچان کی بنیاد پر مارکیٹ سے ادھار مال خرید کر اس کو بیچیں اور نفع نقصان ضمان کے حساب سے ہو۔

(۵) شرکت بنوکیہ کی تعیین: شرکتِ بنوکیہ ''شرکتِ عنان'' ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم نے اپنی کتاب ''غیرسودی بینکاری'' میں لکھا ہے کہ:

۹

''جو لوگ بینک کے اکاؤنٹ میں رقمیں جمع کرتے ہیں وہ باہم ایک دوسرے کے ساتھ شرکت کرتے ہیں پھر یہ سب مل کر بینک سے مضاربت کرتے ہیں جس میں اکاؤنٹ ہولڈر ارباب الاموال ہیں اور بینک مضارب ہے''۔ (غیر سودی بینکاری، ص:۳۱۲)

تنبیہ: حضرت نے یہاں شرکت کا نام نہیں لیا لیکن مراد ان کی بھی یہاں شرکت سے شرکتِ عنان ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جامعہ دارالعلوم کراچی سے شائع ہونے والے ایک مضاربت نامہ میں انہوں نے اس شرکت کو صراحتاً شرکتِ عنان تحریر فرمایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :

''فریقِ اول مذکور اور دیگر اربابِ اموال جنہوں نے فریقِ ثانی کو اپنا سرمایہ مضاربت کی بنیاد پر دیا / دیں گے، ان کے درمیان شرکتِ عقد (بصورتِ شرکتِ عنان) کا معاملہ وجود میں آگیا / آجائے گا، لہٰذا ان شرکاء کے درمیان شرکتِ عنان والے احکام کی پابندی کی جائے گی''۔

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۷/۵۴، از دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)

اسی طرح مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ کے صاحب زادے حضرت مولانا عمران اشرف عثمانی صاحب اپنی کتاب میں ''کمپنی شرکت کی کس قسم میں داخل ہے؟'' کے متعلق تیسرا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کمپنی کی شرکت کس قسم میں داخل ہے؟ پھر اس میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ شرکتِ عنان میں داخل ہے۔ یہ رائے حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ اور موجودہ دور کے

۳۴۰

اکثر علمائے عرب اور عجم بشمول ڈاکٹر عبدالعزیز خیاط اور الاستاذ علی الخفیف اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم وغیرہ کی ہے''۔

(شرکت و مضاربت عصرِ حاضر میں، ص:۳۱۷)

اور شرکتِ عنان سب سے آسان شرکت ہے، اور اس میں بڑی گنجائش ہے، شرکتِ مفاوضہ میں اتنی گنجائش نہیں رہتی، لہٰذا بینکوں کی شرکت شرکتِ مفاوضہ نہیں بن سکتی، اور شرکتِ وجوہ اور شرکتِ صنائع بھی نہیں۔ لہٰذا یہاں شرکتِ عنان ہی بن سکتی ہے، اس لیے کہ شرکتِ عنان میں کسی شریک کو کم نفع دینے اور کسی شریک کو زیادہ نفع دینے کی گنجائش ہے جبکہ شرکتِ مفاوضہ میں اس کی گنجائش نہیں۔

(٦) یہ بات بھی یاد رہے کہ عقدِ شرکت و مضاربت میں خوشی و رضا سے کئے جانے والے خلاف شرع وعدے کرنا و شرائط لگانا، نیز ان کو پورا کرنا اور کسی کی خوشی سے بھی ایک کا حق دوسرے کا دینا ناجائز اور حرام ہے، حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم تحریر فرماتے ہیں:

''اگر کسی خلاف شرع بات کا کوئی وعدہ کیا گیا ہو تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں، مثلاً ایک شریک دوسرے شریک سے یہ وعدہ کرے کہ اگر کاروبار میں کوئی نقصان ہوگا تو میں اس کی تلافی کر کے تمہیں دونگا تو یہ وعدہ بھی چونکہ سارا نقصان ایک فریق پر ڈالنے کا موجب ہے جو شرعاً جائز نہیں اس لئے یہ وعدہ بھی جائز نہیں'' (غیر سودی بینکاری صہ ۱۵۸)

حضرت کی اس واضح تحریر کے بعد بینکوں کے حمایتی جب دلائل کی روشنی میں سمجھ جاتے ہیں کہ واقعی ہمارے اس نظام میں یقیناً ایک کا حق دوسرے کو دیا جا رہا ہے، اور یہ

۴۱

اکل بالباطل اور حرام ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے ﴿یا أیها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل﴾ الآیة کے ذریعے منع فرمایا ہے تو اب حمایتی حضرات یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ یہ حق دوسروں کو اصحاب حق کی خوشی سے کھلایا جا رہا ہے، جبکہ اس عذرِ لنگ کا بطلان حضرت مدظلہ کی عبارت سے واضح اور اظہر من الشمس ہے۔

(۷) واضح رہے کہ ''تمویل'' کے سب سے بڑے جائز طریقے دو ہیں:

(۱) شرکت (۲) مضاربت

چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اموال کو جائز طریقوں سے حاصل کرو اور ناجائز ذرائع سے احتراز کرو، اور شرکت و مضاربت کے ذریعے سب سے زیادہ مال کمایا جا سکتا ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ شرکت و مضاربت شرعی اصولوں کے مطابق ہو، اگر شرعی اصولوں کے خلاف ہے، تو جتنا مال حاصل کیا جائے گا وہ سارا کا سارا ناجائز اور حرام ہوگا، اب یہ بات کہ کون سے شرکت و مضاربت شرعی اصولوں کے مطابق ہے اور کون سی شرعی اصولوں کے خلاف ہے؟ اس سلسلے میں دو باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

(۱) عقدِ شرکت و مضاربت کو دیکھا جائے گا کہ شرعی اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں؟

(۲) صحتِ عقد کے بعد ہونے والے کاروبار کو دیکھا جائے گا کہ شرعی اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں؟

چونکہ اس وقت ہمارا موضوع ''شرکت و مضاربتِ بنوکیہ'' ہے، اس لیے اس تمہید کے بعد اب ہم ''شرکتِ بنوکیہ'' میں ان دو باتوں کا جائزہ لیتے ہیں کہ یہ جائز ہے یا نہیں؟ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ پانچ وجوہ سے یہ شرکت ناجائز ہے، اسی طرح کاروبار جو چار طریقوں پر دیکھا جاتا ہے، جب دیکھا گیا تو اس میں بھی تین باتیں خلافِ شرع سامنے آئیں، اس لیے کسی مسلمان کے لیے اس میں پیسے لگانا اور نفع کے

نام سے کچھ لینا ناجائز اور حرام ہے۔

بینک میں شرکت کرنے کے عدمِ جواز کی وجوہ

جوازِ شرکت دو باتوں پر موقوف ہے:

(۱) عقد شرعی اصولوں کے مطابق ہو۔

(۲) کاروبار بھی شرعی اصولوں کے مطابق صحیح ہو۔

﴿**پہلی بات**﴾ عقدِ شرعی اصولوں کے مطابق ہو، جبکہ پانچ وجوہ سے یہ عقد شرعی اصولوں کے مطابق نہیں بلکہ فاسد ہے۔

عقدِ شرکتِ بنوکیہ کے فساد کی وجوہ خمسہ

(**وجہ نمبر ۱**) : احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرکتِ اموال (عنان و مفاوضہ) کے جواز کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ بوقتِ عقد سب شرکاء کا سرمایہ نقد ہو، جبکہ بینک میں قدیم شرکاء (وہ اکاؤنٹ ہولڈرز جن کا سرمایہ پہلے سے بینک کے پاس کاروبار میں لگا ہوا ہے) کے سرمایہ کا بعض حصہ عروض (سامان اور اثاثوں) کی صورت میں ہوتا ہے، جبکہ جدید شریک (نئے اکاؤنٹ ہولڈرز) کا سرمایہ نقد کی صورت میں ہوتا ہے، لہٰذا یہ شرکت بعض (جدید اکاؤنٹ ہولڈرز) کی طرف سے نقد اور بعض (یعنی قدیم اکاؤنٹ ہولڈرز) کی طرف سے عروض (سامان اور اثاثے) ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔

قال العلامة الکاسانی رحمه الله تعالیٰ : لاتصح الشرکة فی العروض. (وفیه ایضا) : ان معنی الوکالة من لوازم الشرکة والوکالة التی یتضمنها الشرکة لا تصح فی العروض......الخ.

(بدائع الصنائع ۶/ ۵۹، ط: رشیدیه)

قال الامام السرخسي رحمه الله تعالىٰ : فأما الشركة بالعروض من الدواب والثياب والعبيد : لا تصح عندنا وعلى قول ابن أبي ليلى ومالك رحمهما الله هي صحيحة ؛ للتعامل وحاجة الناس إلى ذلك ولاعتبار شركة العقد بشركة الملك وفي الكتاب علل للفساد فقال : لأن رأس المال مجهول يريد به أن العروض ليست من ذوات الأمثال .وعند القسمة لا بد من تحصيل رأس مال كل واحد منهما ؛ ليظهر الربح .فإذا كان رأس مالهما من العروض فتحصيله عند القسمة يكون باعتبار القيمة وطريق معرفة القيمة الحرز والظن ولا يثبت التيقن به . ثم الشركة مختصة برأس مال يكون أول التصرف به بعد العقد شراء لا بيعا وفي العروض أول التصرف يكون بيعا وكل واحد منهما يصير موكلا لصاحبه ببيع متاعه على أن يكون له بعض ربحه وذلك لا يجوز .وقد بينا أن صحة الشركة باعتبار الوكالة .ففي كل موضع لا تجوز الوكالة بتلك الصفة فكذلك الشركة .ومعنى هذا أن الوكيل بالبيع يكون أمينا فإذا شرط له جزء من الربح كان هذا ربح ما لم يضمن والوكيل بالشراء يكون ضامنا للثمن في ذمته فإذا شرط له نصف الربح كان ذلك ربح ما قد ضمن ولأن في الشركة بالعروض ربما يظهر الربح في ملك أحدهما من غير تصرف بتغير السعر فلو جاز استحق الآخر حصته من ذلك الربح من غير ضمان له فيه .وربما يخسر أحدهما بتراجع سعر عروضه ويربح الآخر ؛ فلهذه المعاني بطلت الشركة بالعروض .... وكذلك لا يصح أن يكون رأس مال أحدهما دراهم ورأس مال الآخر عروضا في مفاوضة ولا عنان ؛ لجهالة رأس المال في نصيب صاحب العروض على ما بينا .(المبسوط: ۱۱/۱۷۴،ط:رشيديه)

مالکیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب: مالکیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک سرمایہ عروض کی شکل میں بھی فراہم کرنا جائز ہے، خواہ عروض مثلی (جن کی مثل بازار میں دستیاب ہو) ہوں یا قیمی (جن کی مثل بازار میں دستیاب نہ ہو) عروض چاہے ایک جانب سے ہوں یا دونوں جانب سے۔ جیسے دو آدمی آپس میں شرکت کریں اور ایک آدمی کی طرف سے سرمایہ ایک لاکھ روپے ہو اور دوسرے آدمی کی جانب سے سرمایہ دکان کا سامان ہو، لیکن واضح رہے کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرکت بالعروض کی صحت کے لیے ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ بوقتِ عقد عروض کی بازاری قیمت لگا کر اس کو سرمایہ بنایا جائے تاکہ بعد میں نفع اور نقصان کی تقسیم میں دشواری نہ ہو۔

مثلاً میرا سرمایہ ایک لاکھ ہے اور دوسرے آدمی کی جانب سے سرمایہ دکان کا سامان ہے تو دوسرے آدمی کا سرمایہ کتنا ہے؟ اس کی طرف سے تو سامان ہے تو سامان پر اس کو کیسے نفع دیں گے؟ لہٰذا امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس سامان کی بازاری قیمت لگاؤ پھر جب وہ قیمت لگائی گئی تو مثلاً وہ ۳ لاکھ تھی تو اس کا سرمایہ ۳ لاکھ ہوا، اب اگر نقصان ہوگا تو اس کو نقصان ۳ لاکھ کے تناسب سے ہوگا اور نفع بھی اسی تناسب سے معلوم ہو کر طے شدہ شرح سے تقسیم ہوگا۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب: امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک روایت تو احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کی مانند ہے، اور ایک روایت میں وہ فرماتے ہیں کہ شرکت بالعروض جائز ہے لیکن اسی شرط کے ساتھ جیسا کہ مالکیہ کے مذہب میں گزرا۔

قال العلامة ابن قدامة الحنبلي رحمه الله تعالیٰ : فأما العروض فلا تجوز الشركة فيها في ظاهر المذهب .نص عليه أحمد في رواية أبي طالب وحرب .وحكاه عنه ابن المنذر......وعن احمد رواية اخرى ان الشركة والمضاربة تجوز بالعروض وتجعل قيمتها وقت العقد راس المال ...... وهو قول مالک.

(المغنی ۷/۱۲۴، ط:هجر،قاهره)

شوافع رحمهم الله تعالیٰ کا مذهب: شوافع رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر سرمایہ نقد کے بجائے عروضِ مثلیہ ہو (جس کی مثل بازار میں ملتی ہو) تو بھی شرکت جائز ہے، البتہ اگر عروض قیمی ہوں (بازار میں ان کی مثل نہ ملتی ہو) تو شرکت ناجائز ہے۔

(شرکت ومضاربت عصرِ حاضر میں، ص:۲۴۸، ۲۴۹)

مذہبِ مالکیہ کی جو تفصیل اوپر لکھی گئی ہے، حضرات مجوزین بھی اسی کے قائل ہیں چنانچہ حضرت شیخ الاسلام کے صاحبزادے ڈاکٹر مولانا مفتی عمران اشرف عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

کیا سرمایہ کا نقد ہونا ضروری ہے؟

شرکت کے اندر سرمایہ کیسا ہونا چاہیے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ جو لوگ شرکت قائم کریں ان میں سے ہر شخص اپنی سرمایہ کاری کا حصہ نقد فراہم کرے؟ یا کوئی شریک اپنا حصہ جنس کی صورت میں بھی دے سکتا ہے؟ اس کے بارے میں فقہاء کرام کی آراء مختلف ہیں۔

احناف رحمهم الله تعالیٰ کا مذهب : امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جنس (سامان) کی شکل میں سرمایہ لگا کر شرکت

العقد وجود میں لانا جائز نہیں، خواہ وہ سامان مثلی اشیاء میں سے ہو یا قیمتی اشیاء میں سے ہو۔

مالکیہ کا مذہب : اس کے برعکس مالکیہ کے نزدیک جنس کی شکل میں سرمایہ فراہم کر کے شرکت مطلقاً جائز ہے، خواہ وہ سامان مثلیات میں سے ہو خواہ قیمیات میں سے ہو، نیز یہ بھی جائز ہے کہ دونوں شریک اپنا سرمایہ جنس کی صورت میں فراہم کریں اور یہ بھی جائز ہے کہ ایک شریک نقد روپے لائے اور دوسرے کا سرمایہ جنس کی شکل میں ہو۔

مالکیہ کہتے ہیں جب کوئی شریک سامان کی صورت میں سرمایہ فراہم کرے تو اس کے حصے کا تعین اس سامان کی بازاری قیمت کی بنیاد پر کیا جائے گا

(شرکت ومضاربت عصر حاضر میں:۲۴۸)

نیز لکھتے ہیں :

اگر کوئی شخص کسی چلتی ہوئی صنعت (Industry) میں اپنا روپیہ لگائے اور صنعتکار کے ساتھ شرکت کر لی تو یہ جائز ہے مثلاً زید کا ایک کپڑے کا کارخانہ ہو، اور بکر اس میں ایک لاکھ روپے ڈال کر اس کارخانے میں حصہ دار بن جائے اور اس طرح زید اور بکر اس کپڑے کی صنعت میں شرکت کر لیں اس صورت میں زید کا سرمایہ عروض (جنس) کی شکل میں ہوا اور بکر کا سرمایہ نقد شکل میں، لہذا زید کے کارخانے کی قیمت لگا کر اس کا سرمایہ متعین کیا جائے گا اور اس کی بنیاد پر شرکت قائم کی جا سکے گی کیونکہ یہ بات پیچھے آ چکی ہے کہ سرمایہ شرکت کا نقد ہونا لازمی نہیں ہے۔

(شرکت ومضاربت عصر حاضر میں ص: ۲۵۵)

بعض اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی بوقتِ عقد عروض کی قیمت لگانے کی شرط کی تصریح فرمائی ہے چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کمپنی کے حصص کی خریداری اور اس میں شرکت سے متعلق ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب و اللہ الموفق للحق و الصواب

ا۔ بظاہر اس عقد کی حقیقت شرکتِ عنان ہے، کیونکہ جو لوگ کمپنی قائم کرتے ہیں، وہ دوسروں کو شریک کرنے کے وقت خود کو بھی کمپنی کا ایک حصہ دار قرار دیتے ہیں اور اپنی عماراتِ مملوکہ متعلقہ کمپنی اور جملہ سامان و مال تجارت کو نقد کی طرف محمول کر لیتے ہیں مثلاً ان لوگوں نے دس ہزار روپیہ کمپنی قائم کرنے کے عمارات و سامان وغیرہ میں لگایا تو وہ اپنے کو کمپنی کے سو/۱۰۰ حصوں کا حصہ دار ظاہر کریں گے، البتہ اس صورت میں کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے شرکت بالنقد نہ ہوگی بلکہ بالعروض ہوگی، سو بعض ائمہ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے۔

فیجوز الشرکة و المضاربة بالعروض بجعل قیمتها وقت العقد رأس المال عند أحمد فی روایة و هو قول مالک و ابن أبی لیلی کما ذکره الموفق فی المغنی ۵/۱۲۵

پس ابتلائے عام کی وجہ سے اس مسئلہ میں دیگر ائمہ کے قول پر فتویٰ دے کر شرکت مذکورہ کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔

(امداد الفتاوی ۳/۴۹۴)

وجہ نمبر ۱ کا حاصل! اس کا حاصل یہ ہے کہ مالکیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے

مذہب کے مطابق بوقتِ عقد بازاری قیمت لگانے سے قدیم شرکاء کا سرمایہ یا تو بڑھے گا یا کم ہوگا، جیسے دس لاکھ کے حصے کی بازاری قیمت یا تو مثلاً بارہ لاکھ ہوگی یا مثلاً آٹھ لاکھ ہوگی، اگر قیمت بڑھے گی تو آئندہ کے لیے اس کے سرمایہ اور نفع دونوں میں اضافہ ہوگا جبکہ بازاری قیمت نہ لگانے کی صورت میں اس کا یہ حصہ اور حق دوسروں کو ناحق کھلایا جا رہا ہے، جو کہ ناجائز، حرام اور اکل بالباطل ہے اور اگر بازاری قیمت نہ بڑھے بلکہ کم ہو جائے تو آئندہ کے لیے اس کے سرمایہ اور نفع دونوں میں کمی ہوگی، جبکہ بازاری قیمت نہ لگانے کی صورت میں دوسروں کا حق اس کو ناحق دیا جا رہا ہے، جو کہ ناجائز، حرام اور اکل بالباطل ہے۔

بعض شبہات اور ان کے جوابات:

شبہ نمبر ۱: یہ کہنا کہ عروض کی قیمت نہیں لگائی جاتی، کمپیوٹرائزڈ نظام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ کمپیوٹر کا یہ کمال ہے کہ وہ منٹوں اور سیکنڈوں میں تمام حسابات کر کے سب کچھ بتا دیتا ہے؟

جواب ۱: کمپیوٹر میں وہ کون سا پرزہ ہے جس کے دبانے سے بینک کی وہ تمام مملوکہ اجارہ اور کرایہ پر دی گئیں ہزاروں گاڑیوں اور عملہ کی گاڑیوں اور فرنیچرز اور وہ زمینی اثاثے وغیرہ جو بینک کی ملکیت ہیں جو یقیناً مختلف کنڈیشنز میں ہوتی ہیں، ان میں سے ہر ایک کو مارکیٹ لے جانے اور اس شعبے کے ماہر تاجروں کو دکھائے بغیر محض اس پرزے کے دبانے سے سب کی موجودہ بازاری قیمت سامنے آ جاتی ہے، برائے مہربانی اس پرزے کا نام بتائیے؟

جواب ۲: ہر عمل کے ساتھ اس کے نتیجہ اور اثر کا لازم ہونا ایک مسلّم حقیقت

۴۹

ہے۔عروض کی قیمت لگانے کا عمل اگر واقعۃً عملی طور پر بینکوں میں ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ اور اثر ضرور سامنے آنا چاہیے جبکہ آج تک کسی نے اس کے اثر اور نتیجے کو نہیں دیکھا۔

اس عمل کے نتیجہ اور اثر میں تین احتمال ہیں:

(۱) عروض کی بازاری قیمت بوقتِ عقد جمع کیے ہوئے سرمائے کے مطابق ہو۔

(۲) سرمایہ سے زیادہ ہو۔

(۳) سرمایہ سے کم ہو۔

پہلا احتمال عادۃً محال ہے۔اگرچہ فی نفسہ ممکن ہے کیونکہ اگر تجارت ترقی پر ہے تو احتمال نمبر۲ کا نتیجہ ظاہر ہوگا اور عروض کی قیمت سرمائے سے زیادہ ہوگی، اور اگر زوال پذیر ہے تو احتمال نمبر۳ کا نتیجہ ظاہر ہوگا اور قیمت سرمائے سے کم ہوگی۔

کیا اکثری احتمال پر مبنی نتیجے کے اثر کو آج تک کسی ایک فرد نے بھی دیکھا ہے؟ کیا کبھی بینک نے کسی قدیم شریک کو کہا ہے کہ جدید اکاؤنٹ ہولڈرز کے آنے کے وقت ہم نے آپ کے حصے کے عروض کی قیمت لگائی تو آپ کا سرمایہ بڑھ گیا اور اب آپ کا آئندہ سرمایہ یہی سمجھا جائے گا اور اسی زائد سرمائے کے تناسب سے نفع دیا جائے گا؟؟؟

شبہ نمبر ۲ : ہر ماہ شریک اور کلائنٹ کو جو نفع کے نام سے دیا جاتا ہے وہ تحقیقی نفع ہے یعنی سرمایہ سے جتنا بڑھ رہا ہے وہ سارا کا سارا ہر مہینے دے دیا جاتا ہے اس لیے اس کا سرمایہ ہمیشہ کے لیے اپنے حال پر رہتا ہے؟

جــــواب ۱ : یہ جواب بظاہر حقیقتِ حال سے ناواقفیت پر مبنی اور دفع الوقتی کے لیے گڑھا گیا ہے، کیونکہ حضرات مجوزین خود بھی ہر ماہ تحقیقی نفع دینے کو ناممکن ہی سمجھتے

۵۰

ہیں کہ اتنے بکھرے ہوئے کاروبار کا ہر ماہ تحقیقی حساب متعذر نہیں بلکہ ناممکن ہے۔اس لیے وہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ نفع علی الحساب ہے۔(اگرچہ یہ حساب آج تک دنیا میں تو کسی نے دیکھا نہیں، شاید آخرت میں ہو)

جواب ۲ : اگر بالفرض والتقدیر اس تحقیقی حساب اور نفع کے مفروضے کو مان بھی لیا جائے تو بھی ہمارا اصل اشکال برقرار ہے کیونکہ مثلاً چودہ پندرہ تاریخ کو جو لوگ رقم جمع کرتے ہیں اس وقت قدیم شرکاء کے حصوں کا گزشتہ چودہ پندرہ دنوں کا جو نفع ہوتا ہے، ان کے حصوں کے ساتھ ہوتا ہے تو اس وقت قیمت لگا کر اس کے حصے اور سرمائے کو بڑھانا شرعاً لازم ہے۔جبکہ بینک میں اس کا اہتمام نہیں ہوتا۔ورنہ ثبوت پیش کرے۔

(**وجہ نمبر۲**) : احناف وغیرہ تمام مذاہب میں (معمولی فرق کے ساتھ) جوازِ شرکت کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ سب شرکاء کا سرمایہ حاضر اور موجود ہو کسی کا سرمایہ دَین (ادھار) اور غائب نہ ہو ورنہ شرکت جائز نہ ہوگی، جبکہ شرکتِ بنوکیہ میں قدیم شرکاء کے سرمائے کا بعض حصہ دُیُون (ادھار) کی صورت میں ہوتا ہے کیونکہ بینک کی تمام بیوع مرابحاتِ مؤجلہ (ادھار کے کاروبار کی صورت میں) ہوتی ہیں، لہٰذا شرکت بنوکیہ اس وجہ کی رو سے ناجائز ہے۔

قال ملک العلماء الکاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ: ومنها : أن يكون رأس مال الشركة عينا حاضرا لا دينا ولا مالا غائبا فإن كان لا تجوز عنانا كانت أو مفاوضة لأن المقصود من الشركة الربح وذلك بواسطة التصرف ولا يمكن في الدين ولا المال الغائب فلا يحصل المقصود وإنما يشترط الحضور عند الشراء لا عند

۱

العقد لأن عقد الشركة يتم بالشراء فيعتبر الحضور عنده حتى لو
دفع إلى رجل ألف درهم فقال له : أخرج مثلها واشتر بهما وبع
فما ربحت يكون بيننا فأقام المأمور البينة أنه فعل ذلك جاز
وإن لم يكن المال حاضرا من الجانبين عند العقد لما كان
حاضرا عند الشراء. (بدائع الصنائع،۵/ ۷۹،ط: رشيديه جديد)

مالکیہ رحمھم اللہ تعالیٰ کا مذہب: سرمایہ کا عقد کے وقت موجود ہونا ضروری ہے لہٰذا اگر دونوں طرف سے مال موجود نہ ہو یعنی ایک طرف سے مال آجائے اور دوسری جانب سے نہ آیا ہو تو شرکت کی صحت کے لیے دو شرطیں ضروری ہوں گی:

(۱) غائب مال کے آنے تک دونوں شریک کام نہ کریں۔

(۲) غائب مال بہت دور نہ ہو، پھر بعض مالکیہ کے ہاں مطلب یہ ہے کہ دو دن کے اندر اندر آسکے اور بعض نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ اس کی آمد میں دس روز لگ سکیں۔

حنابلہ اور شوافع رحمھم اللہ تعالیٰ کا مذہب: فقہائے حنابلہ وشوافع رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرکت میں مال کا موجود ومتعین ہونا بوقتِ عقد ضروری ہے چنانچہ اگر مال موجود نہ ہو یا کسی کے ذمہ دَین (ادھار) ہو تو بغیر کسی قید اور شرط کے شرکت ناجائز ہوگی، اس لیے کہ ان کے ہاں شرکت میں مال کا مخلوط کرنا شرط ہے اور جب مال ہی نہ ہو تو سرمایہ مخلوط کیسے ہو سکے گا؟۔

مذاہب کی یہی تفصیل کتاب ''شرکت ومضاربت عصرِ حاضر میں'' ۱۹۹تا۲۰۱ میں حضرت مفتی تقی صاحب مدظلہ کے صاحبزادے مولانا عمران اشرف صاحب نے بھی لکھی ہے۔

۵۲

وجہ نمبر ۲ کے اعتبار سے سب سے آسان اور اسہل مذہب احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے جبکہ شرکتِ بنوکیہ اس اسہل مذہب کے اعتبار سے بھی ناجائز ہے کیونکہ بینک میں قدیم شرکاء کا سرمایہ چار حصوں پر مشتمل ہوتا ہے:

(۱) نقد روپیہ

(۲) منجمد اثاثے

(۳) تجارتی سامان (جو خریدا جاچکا ہو لیکن ابھی تک آگے نہ بیچا گیا ہو)

(۴) دیون (یعنی مرابحات کی صورت میں ادھار بیچے گئے عروض وسامان کا وہ قرض جو خریدار کے ذمہ قسط وار واجب الادا ہے)

ان میں ایک جزء اور حصہ دیون اور ادھار کا بھی ہے جس کی وجہ سے قدیم شرکاء کے ساتھ شرکت ائمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے کسی کے مذہب کے مطابق جائز نہ ہوگی۔

وجہ نمبر ۲ کا حاصل: اس کا حاصل یہ ہے کہ شرکتِ بنوکیہ میں جدید شرکاء کی شرکت کے وقت قدیم شرکاء کے حصوں کا ایک جزء دوسروں پر دیون اور ادھار کی صورت میں بھی ہوتا ہے، لہٰذا جتنی مقدار دوسروں پر دَین اور ادھار ہے اتنی مقدار میں نہ تو شرکت (شرکتِ اموال) منعقد ہوگی اور نہ اس کا نفع حلال ہوگا، جبکہ بینک میں جدید شرکاء کی شرکت کے بعد قدیم شرکاء کو اس جزء (یعنی دُیون اور ادھار) سمیت اپنے مکمل سرمائے کا نفع ملتا ہے جو کہ واضح طور پر دوسروں کا حق ہے اور ان کو ناحق دیا جا رہا ہے اور یہ حرام، ناجائز اور اکل بالباطل ہے۔

(**وجہ نمبر۳**): بینک سرمایہ سے زیادہ کاروبار کرتا ہے جس کو ''استدانہ'' کہتے ہیں اور یہ دو وجہ سے جائز نہیں۔

۳

۱۔ اس کے لیے رب المال سے صریح اجازت لینا ضروری ہے جبکہ بینک اجازت نہیں لیتا، ورنہ ثبوت پیش کریں۔

۲۔ اجازت کے بعد چونکہ اس میں شرکت وجوہ ہے اس لیے استدانہ کے اموال و حسابات کا علیحدہ رکھنا ضروری ہے جبکہ بینک کو نہ یہ مسئلہ معلوم ہے اور نہ ہی اس پر عمل کرتے ہیں، ورنہ ثبوت فراہم کریں۔

قال الامام السرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ : وَمَا استَدَانَ سَوَاءٌ كَانَ بِقَدرِ مَالِ المُضَارَبَةِ أَو أَقَلَّ أَو أَكثَرَ فَهُوَ بَينَهُمَا نِصفَانِ فَرِبحُهُ وَوَضِيعَتُهُ بَينَهُمَا نِصفَانِ حَتَّى لَو هَلَكَتِ المُشتَرَاةُ بِالدَّينِ كَانَ ضَمَانُ ثَمَنِهَا عَلَيهِمَا نِصفَينِ .

وَلَو كَانَ أَمَرَهُ أَن يَستَدِينَ عَلَى نَفسِهِ كَانَ مَا اشتَرَاهُ المُضَارِبُ بِالدَّينِ لَهُ خَاصَّةً دُونَ رَبِّ المَالِ ؛ لِأَنَّهُ فِي الاستِدَانَةِ عَلَى نَفسِهِ يَستَغنِي عَن أَمرِ رَبِّ المَالِ فَكَانَ وُجُودُ أَمرِهِ فِيهِ وَعَدَمُهُ سَوَاءً .... وَلَا تَكُونُ هَذِهِ الشَّرِكَةُ بِطَرِيقِ المُضَارَبَةِ ؛ لِأَنَّ المُضَارَبَةَ لَا تَصِحُّ إلَّا بِرَأسِ مَالٍ عَينٍ فَكَانَت هَذِهِ الشَّرِكَةُ فِي مَعنَى شَرِكَةِ الوُجُوهِ فَيَكُونُ المُشتَرَى مُشتَرَكًا بَينَهُمَا نِصفَينِ فَلَا يَصِحُّ مِنهُمَا شَرطُ التَّفَاوُتِ فِي الرِّبحِ مَعَ مُسَاوَاتِهِمَا فِي المِلكِ فِي المُشتَرَى .

(المبسوط، باب المضارب یأمرہ رب المال ۲۲/۱۶۳، ط:رشیدیہ)

استدانہ اور بیع نسیئۃ میں فرق : ''بیع نسیئۃ'' کہتے ہیں سرمائے

۵۴

کے اندر اندر ادھار خریداری کرنا جیسے ایک ارب روپے سرمایہ ہے اور 1 ارب روپے کی خریداری کی گئی، لیکن ادائیگی پچاس کروڑ کی کی گئی اور پچاس کروڑ کا ادھار لیا گیا تو یہ ''بیع نسیئہ'' کہلائے گا اور کاروبار میں اس کی اجازت ہوتی ہے۔

استدانہ یہ ہے کہ سرمائے سے زیادہ ادھار خریداری کی جائے جیسے ایک ارب روپے کے سرمائے کی بنیاد پر تین ارب کا کاروبار کرلیا جائے تو یہ سرمایہ سے زائد کاروبار ''استدانہ'' ہے، جس کا حکم اوپر بیان ہوا۔

لہٰذا بینک کا زائد کاروبار کرنا ''استدانہ'' ہے نہ کہ ''نسیئہ''۔ (جیسے کہ بعض حضرات کو تسامح ہوا ہے، اور انہوں نے ''نسیئہ'' کے جواز کی عبارت سے رب المال کی اجازت کے بغیر صرف عرفِ تجار کی وجہ سے استدانہ کا جواز تحریر فرمایا ہے)

وجہ نمبر ۳ کا حاصل : اس کا حاصل یہ ہے کہ سرمائے کا وہ حصہ جو مضاربت کے سرمائے سے الگ ہے، کے کاروبار کا حساب اور جملہ معاملات جُدا جُدا رکھنا ضروری ہے تاکہ ناحق کسی کا حق کوئی نہ کھائے، جبکہ بینک ایسا نہیں کرتا اور خلط ملط کر کے ایک کو دوسرے کا حق ناحق طور پر دیتا ہیں، اور یہ ناجائز، حرام اور اکل بالباطل ہے۔

(وجہ نمبر٤) : بینک کرنٹ اکاؤنٹ سے بھی مشترک کاروبار کرتا ہے جبکہ یہ قرض ہے، اور رب المال قرض کی صراحۃً اجازت بھی دیدے تو بھی قرض کا ضمان مضارب ہی پر ہوتا ہے، لہٰذا اس کا نفع ونقصان دونوں کا تعلق مضارب اور بینک سے ہوگا نہ کہ رب المال سے اور اس قرض سے خریدا ہوا سارا مال اور اس کا حساب علیحدہ رکھنا ضروری ہے، جبکہ بینک اس طرح نہیں کرتا ورنہ ثبوت پیش کرے۔

۵

قال الامام السرخسی رحمه الله تعالیٰ: وَ الْأَصَحُّ أَنْ يَقُولَ: الْأَمْرُ بِالِاسْتِقْرَاضِ بَاطِلٌ. أَلَا تَرَى أَنَّهُ لَوْ أَمَرَ رَجُلًا أَنْ يَسْتَقْرِضَ لَهُ أَلْفًا مِنْ فُلَانٍ فَاسْتَقْرَضَهَا كَمَا أَمَرَهُ كَانَ الْأَلْفُ لِلْمُسْتَقْرِضِ دُونَ الْآمِرِ .... و ما كان الأمر بالاستقراض الا نظير الامر بالتكدى و هو باطل، و ما يحصل للمتكدى يكون له دون الآمر. (المبسوط للسرخسی، باب المضارب یأمره رب المال ۲۲/۱۶۴، ۱۶۵، ط: رشیدیه)

وجہ نمبر ٤ کا حاصل: اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ مختلف سرمایوں کو خلط ملط نہ کیا جائے، جبکہ بینک ایسا کرتا ہے اور یہ ناجائز وحرام ہے اور اکل بالباطل کو مستلزم ہے۔

تنبیہ: کرنٹ اکاؤنٹ کی بنیاد پر بینک کئی سہولتیں بھی فراہم کرتا ہے، جیسے ATM کارڈ، آن لائن بینکنگ، آن لائن رقوم کی ترسیل وغیرہ وغیرہ اور یہ کل قرض جر منفعۃ فھو ربا میں داخل اور صریح سود ہے۔ اور اس کے سود ہونے کا اقرار ایک اسلامی نامی بینک کے منیجر نے کیا کہ یہ کہنا کہ سیونگ اکاؤنٹ میں سود ہے اور کرنٹ میں نہیں، غلط ہے، بلکہ کرنٹ میں بھی سروس کی سہولتیں قرض کی وجہ سے دی جا رہی ہیں اور یہ سود ہے۔

(وجہ نمبر ۵): شرکت عنان (اموال) میں ایسی شرط لگانا جو شرکت فی الربح کے لیے قاطع ہو، ناجائز اور مفسدِ عقد ہے، جبکہ شرکتِ بنوکیہ میں یہ شرط بھی ہوتی ہے، کیونکہ بینک کے اکثر ملازمین جن کو تقسیمِ ربح سے قبل تنخواہیں دی جاتی ہیں، وہ ہیں جو شریک بھی ہیں۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی یہ شرکت ناجائز، فاسد اور باطل ہے۔

قال الامام ابن الهمام رحمه الله تعالیٰ: قَوْلُهُ: (وَ لَا تَجُوزُ الشَّرِكَةُ إِذَا شُرِطَ لِأَحَدٍ دَرَاهِمُ مُسَمَّاةٌ مِنَ الرِّبْحِ) قَالَ ابْنُ الْمُنْذِرِ: لَا خِلَافَ

فِي هَذَا لِأَحَدٍ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ. (الفتح ۶/۱۷۰، ط: رشیدیه)

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

شریک کا اجیر ہونا درست نہیں، بلکہ صورتِ جواز یہ ہے کہ جو شریک منیجر ہو اس کا حصہ منافع میں زیادہ کر دیا جائے، مثلاً جو شریک منیجر نہیں ان کا حصہ روپیہ میں دو آنہ ہے تو منیجر کا حصہ روپیہ میں چار آنہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ جائز نہیں کہ اس کی تنخواہ مقرر کی جائے۔ (امداد الاحکام: ۳/۴۲۴)

وجہ نمبر ۵ کا حاصل: اس کا حاصل یہ ہے کہ جب شرکت فاسد ہوگئی تو سارا کا سارا نفع ارباب الاموال (سرمایہ لگانے والوں) کا ہوگا اور مضارب یعنی بینک کو صرف اجرِ مثل ملے گا، اجرِ مثل سے زیادہ لینا، ناجائز، حرام اور اکل بالباطل ہے۔

﴿**دوسری بات**﴾ کاروبار بھی شرعی اصولوں کے مطابق صحیح ہو۔

کاروبار شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں چار باتوں کا اطمینان ضروری ہے:

١۔ کاروبار سرمایہ کے مطابق ہو۔

٢۔ کاروبار جائز ہو۔

٣۔ روزمرہ کے معاملات شرعاً درست ہوں۔

۴۔ نفع ونقصان کی تقسیم کا طریقہ کار شریعت کے مطابق ہو۔

مروجہ اسلامی نامی بینکوں میں ان چاروں باتوں میں سے تین کا اطمینان نہیں جس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) کاروبار سرمایہ کے مطابق ہے یا نہیں؟

اس کے اطمینان کے لیے ضروری ہے کہ کل سرمایہ معلوم ہو جبکہ بینک میں کل سرمایہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہوتا، بلکہ معلوم ہونا ممکن ہی نہیں اور کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ اس ماہ یا سال کتنے سرمایہ سے کاروبار ہوا کیونکہ ان بینکوں میں ہر دن بلکہ ہر گھنٹہ ومنٹ میں سرمایہ بدلتا رہتا ہے حالانکہ نفع ونقصان کی صحیح تقسیم کے لیے بوقتِ تقسیم شرعاً یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ ابتدائے عقد سے ہمارے پاس اتنا سرمایہ تھا جس سے اب تک کاروبار ہوا گویا کہ پوری مدتِ تجارت میں سرمایہ کا ایک ہونا اور بوقتِ تقسیم معلوم ہونا ضروری ہے۔

قال الامام السرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ لَا يَصِحُّ أَنْ يَكُونَ رَأْسُ مَالِ أَحَدِهِمَا دَرَاهِمَ وَ رَأْسُ مَالِ الآخَرِ عُرُوضًا فِي مُفَاوَضَةٍ وَ لَا عَنَانٍ ؛ لِجَهَالَةِ رَأْسِ المَالِ فِي نَصِيبِ صَاحِبِ العُرُوضِ عَلَى مَا بَيَّنَّا . (المبسوط: ۱۱/۱۷۴، ط: رشیدیہ)

البتہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بوقت عقد شرط ہے اور احناف کے نزدیک وقتِ شراء تک بھی اگر معلوم ہو جائے تو بھی درست ہے۔

و قال الامام الکاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ: وَ أَمَّا العِلْمُ بِمِقْدَارِ رَأْسِ المَالِ وَقتَ العَقْدِ فَلَيسَ بِشَرطٍ لِجَوَازِ الشَّرِكَةِ بِالأَموَالِ عِندَنَا وَ عِندَ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللّٰهُ شَرطٌ وَجهُ قَولِهِ أَنَّ جَهَالَةَ قَدرِ رَأْسِ المَالِ تُؤَدِّي إِلَى جَهَالَةِ الرِّبحِ وَ العِلْمُ بِمِقدَارِ الرِّبحِ شَرطُ جَوَازِ هَذَا العَقدِ فَكَانَ العِلْمُ بِمِقدَارِ رَأْسِ المَالِ شَرطًا وَ لَنَا: أَنَّ الجَهَالَةَ لَا تَمنَعُ جَوَازَ العَقدِ لِعَينِهَا بَل لِإِفضَائِهَا إِلَى المُنَازَعَةِ وَ جَهَالَةُ رَأْسِ المَالِ وَقتَ العَقدِ لَا تُفضِي إِلَى المُنَازَعَةِ؛ لِأَنَّهُ يُعلَمُ

۵۸

مِقدَارُهُ ظَاهِرًا وَ غَالِبًا؛ لِأَنَّ الدَّرَاهِمَ وَ الدَّنَانِيرَ تُوزَنَانِ وَقتَ الشِّرَاءِ فَيُعلَمُ مِقدَارُهَا فَلَا يُؤَدِّي إِلَى جَهَالَةِ مِقدَارِ الرِّبحِ وَقتَ القِسمَةِ . (بدائع الصنائع ۵/۸۴، ط: رشیدیہ جدید)

نمبر ۱ کا حاصل: اس کا حاصل یہ ہے کہ جب تحقیقی اور واقعی بنیادوں پر سرمایہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تو اب منافع تخمینہ اور اندازے سے تقسیم ہونگے، اور اس صورت میں یقیناً ایک کا حق دوسرے کے پاس ناحق طور پر جائے گا اور یہ ناجائز، حرام اور اکل بالباطل ہے۔ اسی وجہ سے قربانی کی گائے کے گوشت کی تخمینہ اور اندازہ سے تقسیم کو بھی کتب فقہیہ میں ناجائز اور حرام لکھا ہے، اگرچہ یہ تقسیم باہمی رضامندی سے ہی کیوں نہ ہو۔

(۲) روز مرہ کے معاملات بھی خلاف شرع ہیں:

کیونکہ ان بینکوں میں جو اجارات و بیوعاتِ مرابحہ ہوتے ہیں وہ درج ذیل وجوہ سے فاسد اور ناجائز ہیں، اور معاملاتِ فاسدہ بحکمِ سود اور ان سے حاصل ہونے والا نفع حرام اور واجب التصدق ہے، جبکہ بینک بجائے تصدق کے ان حرام منافع کو ارباب الاموال (اکاؤنٹ ہولڈرز) میں تقسیم کر کے سب کو حرام کھلاتا ہے۔

وجوہ مُفسدہ:

(الف) مقتضائے عقد کے خلاف شرائط لگائی جاتی ہیں جیسے محدود ذمہ داری کی شرط پر خریداری کرنا، عقد سے قبل وعدۂ اجارہ و بیع کر کے اس کو پورا کرنے پر مجبور کرنا، اور انکار کی صورت میں جرمانہ کرنا، تاخیر قسط کی صورت میں التزام تصدق کی شرط لگانا وغیرہ وغیرہ۔

(ب) سیکورٹی ڈیپازٹ جو کہ قرض ہے سے استیجار اور شراء کا نفع حاصل کرنا جو

٥٩

''کل قرض جر منفعة فهو ربا'' (الحدیث) میں داخل اور صریح سود ہے۔

(ج) اجارہ میں شےءِ موجَر کی مرمت کے اخراجات متاجر کے ذمہ لگانا۔

نمبر ٢ کا حاصل: اس کا حاصل یہ ہے کہ اس میں دو بڑے گناہ ہیں:

(١) سود کا گناہ، کیونکہ بیوعات اور اجاراتِ فاسدہ بحکمِ سود ہیں اور سود کی قباحت سب کو معلوم ہے۔

(٢) بیعِ فاسد سے جو سامان خریدا جائے اس پر نفع حاصل کرنا، حرام اور اکل بالباطل ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ بینک میں رقم جمع کرنے والے سب سود اور حرام کھانے کے گناہ کے مرتکب ہیں۔ اور ان پر واجب ہے کہ آج تک نفع کے نام سے جس قدر لے چکے ہیں، اس کو مساکین پر بدوں نیت ثواب صدقہ کریں۔

(٣) نفع و نقصان کی تقسیم کا طریق کار بھی خلاف شرع ھے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تقسیمِ منافع کے دو طریقے لکھے گئے ہیں:

ایک ''کتاب 'غیرسودی بینکاری'' (از دارالعلوم کراچی) میں اور دوسرا طریقہ کتاب ''غیرسودی بینکاری'' از رفقاء دار الافتاء جامعۃ الرشید میں ہے، .... اور دونوں طریقے حدیث ''الخراج بالضمان'' اور حدیث ''الغنم بالغرم'' اور حدیث ''لایحل ربح مالم یضمن'' اور درج ذیل عباراتِ فقہیہ کے خلاف ہیں۔

قال الامام السرخسی رحمه الله تعالیٰ: .... لِأَنَّهُ لَو صَحَّ ذٰلِکَ اسْتَحَقَّ أَحَدُهُمَا جُزْءًا مِن رِبحِ مَا ضَمِنَهُ صَاحِبُهُ وَ ذٰلِکَ

لَا یَجُوز .... لِأَنَّ أَحَدَهُمَا یَشتَرِطُ لِنَفسِهِ رِبحَ مَا قَد ضَمِنَ صَاحِبُهُ وَ ذٰلِکَ بَاطِلٌ. (المبسوط: ٢٢/١٦٣)

١۔ منافع کی تقسیم کا طریقہ اول: جیسے زید اور عمرو نے بیس بیس لاکھ مثلاً جمع کر کے چھ ماہ تک کاروبار کیا، چھ ماہ کے بعد بکر سے بھی بیس لاکھ لے کر اس کو بھی ایک تہائی کاروبار میں شریک کرلیا، اور یہ طے کرلیا کہ سال کے آخر میں بکر کو کل سالانہ منافع کا ١/٦ حصہ دیا جائے گا۔ چونکہ یہ طریقہ ''ربح مالم یضمن'' کو متضمن ہے اس لیے ناجائز ہے۔ دیکھیے! اگر شروع چھ ماہ میں چالیس لاکھ پر بارہ لاکھ نفع ہوا اور آخری چھ ماہ میں بکر کے سرمائے کے آنے کے بعد ساٹھ لاکھ پر مثلاً چھ لاکھ نفع ہوا، تو اب اس صورت میں بکر چونکہ آخری چھ ماہ میں شریک ہوا ہے تو اس کو صرف آخری چھ ماہ کے نفع میں سے ١/٣ یعنی دو لاکھ ملنا چاہیے، اور ابتداء کے چھ ماہ میں چونکہ نہ یہ شریک تھا اور نہ اس پر ضمان تھا، لہٰذا اس کا نفع صرف زید اور عمرو کو ملنا چاہیے، نہ کہ بکر کو، جبکہ تجویز کردہ طریقے میں بکر کو بھی ملتا ہے، کیونکہ ابتداء کے بارہ لاکھ + آخری چھ لاکھ، یہ کل اٹھارہ لاکھ ہوئے جن کا ١/٦ تین لاکھ ہوئے، یہ بکر کا حصہ ہوا، اس حصے میں بکر کو گزشتہ ان چھ ماہ کا بھی ایک لاکھ نفع دیا گیا، جن میں بکر پر ضمان نہیں تھا، لہٰذا یہ نفع و ربح مندرجہ بالا احادیث اور عباراتِ فقہیہ کے خلاف اور ناجائز اور حرام ہے۔

نیز آخری چھ ماہ میں گزشتہ چھ ماہ کے نفع جس کی مقدار بارہ لاکھ ہے، سے بھی کاروبار ہوا ہے، لہٰذا اس کا نفع بھی صرف زید اور عمرو کو ملنا چاہیے، جبکہ تجویز کردہ طریقہ کار میں اس نفع میں بکر کو بھی شریک کیا گیا ہے، حالانکہ اس شرکت کے جواز کی کوئی شرعی وجہ نہیں ورنہ بتادی جائے۔

۱

۲۔تقسیمِ منافع کا طریقہ دوم :جو کہ''رفقاء دارالافتاء جامعۃ الرشید'' نے بیان کیا ہے۔اس میں جن دنوں میں سرمایہ حقیقۃً کم ہے اوراوسطاً زیادہ ہے ان میں اس رب المال (اکاؤنٹ ہولڈر) کو "**ربح مالم یضمن** "(یعنی بدوں ضمان نفع) حاصل ہوا جو کہ حرام ہے اور دوسروں پر ظلم ہے،اور جن دنوں میں سرمایہ زیادہ اور اوسط کم ہے،تو ان میں دوسروں کو"**ربح مالم یضمن** " حاصل ہوااوراس پر ظلم ہوا، ......جبکہ نقصان کی صورت میں اس کا عکس ہے (یعنی اگر کاروبار میں بجائے نفع کے نقصان ہوا تو جن دنوں میں اوسط زیادہ ہے اور سرمایہ کم ہے،ان دنوں میں اس کو نقصان کم ہونا چاہیے تھا،جبکہ اس کو سرمائے سے زیادہ نقصان دیا جارہا ہے اور یہ اس پر ظلم ہے،اور جن دنوں میں سرمایہ زیادہ اور اوسط کم ہے ان دنوں میں اس کا نقصان زیادہ ہونا چاہیے،جبکہ اس پر کم نقصان ڈالا جارہا ہے جو دوسروں پر ظلم ہے۔)

تنبیہ : مذکورہ بالا طریقہ اول کتاب غیر سودی بینکاری از مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہم،ص:۱۱۷ میں ایک سادہ سی مثال الخ کے تحت اور دوسرا طریقہ کتاب غیر سودی بینکاری از رفقاء دارالافتاء جامعۃ الرشید،ص:۱۳۰تا۱۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں۔

نمبر ۳ کا حاصل : اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ بینک والے احادیثِ ثلاثہ جن میں اصولِ مسلمہ کا بیان ہے،کی خلاف ورزی اور حضرات فقہاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی تصریحات سے صَرفِ نظر کی وجہ سے ناجائز،حرام اور اکل بالباطل کے مرتکب ہیں۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ۔

۲

شرکت ومضاربت شروع ہونے کے بعد بعض شرکاء کا کل یا بعض رقم نکلوانے کا طریقہ کار

مجوزین حضرات فرماتے ہیں کہ یہ بیع ہے اور بینک مارکیٹ ویلیو کے مطابق قیمت لگا کر دوسرے شرکاء کے لیے خریدتا ہے اور نکلنے والے کو اصل سرمایہ مع طے شدہ شرح نفع کل رقم دی جاتی ہے۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم فرماتے ہیں:

جو شخص اپنی رقم اس مشترک حوض سے نکلوانا چاہتا ہے وہ درحقیقت اپنا حصہ جزوی یا کلی طور پر دوسرے شرکاء کو فروخت کردیتا ہے اور اس کی قیمت لگاتے وقت کاروبار کی اس وقت کی حیثیت مدِ نظر رکھی جاتی ہے ....

(آگے لکھتے ہیں) اب بات اس قیمت کی رہ جاتی ہے جس پر شرکاء وہ حصہ خریدیں،اس کا منصفانہ فارمولا یہی ہوسکتا ہے کہ اگر اس وقت اثاثوں کو بازار میں فروخت کیا جاتا اور اس وقت نکلنے والے شریک کا رأس المال میں اور اگر اس وقت تک نفع ہوا ہو تو نفع میں جتنا حصہ بنتا اس کے حصے کی اتنی ہی قیمت لگائی جائے گی اور نفع کا حصہ اس تناسب سے مقرر کیا جائے گا،جو شرکت کے وقت طے ہوا تھا۔(غیر سودی بینکاری:۳۲۷،۳۳۳)

جامعۃ الرشید سے شائع شدہ کتاب میں لکھا ہے:

''......جبکہ شریک سے بینک جب حصہ خریدتا ہے تو:

(۱) مارکیٹ ویلیو (جو کہ عملاً BookValue ہوتا ہے) پر خریدتا ہے۔

(۲) بینک اس وقت تک کا نفع بھی رب المال کو اس کی قیمت میں شامل

کر کے دیتا ہے۔ (غیر سودی بینکاری از جامعۃ الرشید ص:۱۲۷)

تنبیہ : ان حضرات کی یہ خبر خلافِ واقع معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بینک سے کلی یا جزوی طور پر رقم نکلوانے والوں کی دو قسمیں ہیں:

(۱) سرمایہ کاری کی مدت مکمل ہونے کے بعد نکالنے والے۔

(۲) تکمیلِ مدت سے پہلے نکالنے والے۔

دوسری قسم کے لوگ جب مدت سے پہلے رقم نکالتے ہیں تو قلیل مدت کے ''ویٹ'' کے تناسب سے بینک اصل رقم (سرمایہ) سے کٹوتی کر کے بقیہ واپس کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ ہی بازاری قیمت لگاتے ہیں اور نہ ہی سرمایہ مع نفع واپس کرتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو دیا ہوا نفع بھی واپس لے لیتے ہیں، اس کی مزید تفصیل ''ویٹیج'' کی وضاحت پر موقوف ہے۔

ویٹیج کی وضاحت:

جو شخص زیادہ مدت کے لیے بینک میں رقم لگواتا ہے بینک اس کے پیسے کا ویٹ اور قیمت زیادہ مقرر کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں اس کو نفع زیادہ ملتا ہے، اور جو کم مدت کے لیے لگاتا ہے اس کے پیسے کا ویٹ اور قیمت کم ہوتی ہے، بالفاظِ دیگر اسے نفع کم ملتا ہے۔ مثلاً زید اور بکر دونوں نے بینک میں دس دس لاکھ روپے جمع کروائے لیکن زید نے پانچ سال کے لیے اور بکر نے دس سال کے لیے، اب بینک زید کو مدت کی کمی کی وجہ سے اس کے لیے جو شرحِ نفع مقرر کرتا ہے اس کے حساب سے ماہانہ فی لاکھ مثلاً ۱،۰۰۰ (ایک ہزار) روپے نفع بنتا ہے لیکن بکر نے چونکہ زیادہ مدت کے لیے رقم جمع کروائی ہے اس لیے بینک بکر کے روپے کی شرحِ نفع زیادہ مقرر کرتا ہے جس کے تناسب سے

ماہانہ فی لاکھ مثلاً ۱۵۰۰ (پندرہ سو) روپے نفع بن جاتا ہے۔

شرحِ نفع کے اس اختلاف کا حاصل یہ ہوا کہ زید کے مقابلے میں بکر کو ہر ماہ ۵،۰۰۰ (پانچ ہزار روپے)، ہر سال ۶۰،۰۰۰ (ساٹھ ہزار روپے) اور پانچ سال میں ۳۰۰،۰۰۰ (تین لاکھ روپے) نفع زیادہ ملے گا۔

اب بالفرض زید کی شرکت کی مدت تو ختم ہوگئی لیکن بکر کی مدت ابھی پانچ سال مزید باقی ہے، لیکن بعض وجوہ کی بنا پر بکر کو ابھی اپنا پیسہ نکالنے کی ضرورت پیش آگئی جس کی وجہ سے بکر نے کہا کہ میں اپنا پیسہ نکلوانا چاہتا ہوں اب بینک اس کو یہ کہتا ہے کہ آپ اپنا حصہ بینک کو ہی بیچ کر نکال سکتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ میں (بینک) آپ (بکر) کے حصہ کی قیمت اتنی کم کر کے لگاؤں گا تاکہ یہ زیادہ نفع جو آپ (بکر) نے لیا ہے، وہ مجھے واپس وصول ہو جائے لہٰذا بینک اس سے اس کا حصہ سات لاکھ میں خریدتا ہے تاکہ تین لاکھ نفع جو زید کے مقابلے میں زیادہ لیا تھا وہ واپس ہو جائے، جبکہ بکر کے اس حصے کے مثلاً تین خریدار اور بھی ہیں جن میں سے ایک دس لاکھ میں، دوسرا گیارہ لاکھ میں اور تیسرا بارہ لاکھ میں خریدنے کو تیار ہے اور اس خریداری میں وہ اپنا نفع سمجھتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ یہ تینوں اگر براہِ راست بینک کے پاس مثلاً پانچ سال کے لیے رقم جمع کر کے اکاؤنٹ کھلواتے ہیں، تو پانچ سال میں بکر کو جو تین لاکھ زیادہ ملنے والے تھے وہ انہیں نہیں ملیں گے، کیونکہ اس صورت میں ان کے حصے کی شرحِ نفع فی لاکھ مثلاً ایک ہزار روپے ہوگا، اور بکر کا حصہ خریدنے کی صورت میں شرحِ نفع مثلاً فی

٥

لاکھ پندرہ سو ہوگا، جس کے نتیجے میں پہلے خریدار کو تین لاکھ، دوسرے کو دو لاکھ اور تیسرے کو ایک لاکھ پانچ سال میں زیادہ نفع ملے گا۔ بینک اس (بکر) کو بینک ہی کو سات لاکھ میں بیچنے پر مجبور کرتا ہے اور دوسروں کو اس کے حصے کو زیادہ قیمت پر خریدنے سے روکتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بینک تین لاکھ گزشتہ اور تین لاکھ آئندہ کل چھ لاکھ خود ہڑپ کرنا چاہتا ہے، اور ایک مفتی صاحب کے قول کے حاصل کے پیشِ نظر: ''دونوں کا خون چوستا ہے'' اور اس چوسنے کے ثواب اور عقاب کا ذمہ دار علماء کو بناتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بینک اس دوسری قسم کے رب المال کے لیے حصہ فروخت کرتے وقت بازاری قیمت بھی نہیں لگاتا اور نہ ہی نفع دیتا ہے بلکہ بازاری قیمت سے اتنی کم قیمت لگاتا ہے، جس کی وجہ سے گزشتہ سالوں میں لیا گیا بعض نفع بھی واپس ہو جائے۔

اعجوبہ : پچھلے ماہ تک بکر کا حصہ ہر ماہ پندرہ ہزار نفع کماتا رہا، اس ماہ جب حصہ بیچنے لگا تو یکدم دھڑام سے اس کا حصہ تین لاکھ نقصان پر چلا گیا (حالانکہ اگر اس ماہ بیچنے کی بات نہ کرتا تو بھی اس کا حصہ پندرہ ہزار کا نفع کماتا بلکہ آئندہ پانچ سال تک کماتا) یہ ایک اعجوبہ تو ہو سکتا ہے، اس کو کون ذی فہم حقیقت کہہ سکتا ہے؟ نیز تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ اس کے دوست زید کے حصے کی قیمت اسی تاریخ میں بازار میں دس لاکھ لگ رہی ہے، اس لیے اس کو دس لاکھ واپس دیے جا رہے ہیں اور بکر بیچارے کے حصہ کی قیمت اسی دن سات لاکھ لگ رہی ہے۔............ببین تفاوت راہ از کجا است تا بکجا............

جبکہ دونوں کا کاروبار مشترک ہے اور حصص کی حقیقت میں بازار کے اعتبار سے کوئی فرق بھی

نہیں ہے۔

الحاصل : نہ بینک کسی کے حصے کی بازاری قیمت لگاتا ہے، اور نہ ہی یہ بیع وشراء ہے، اسی وجہ سے بینک کے بعض منیجروں کا کہنا ہے کہ ہم یہ بیع وشراء نہیں جانتے، ہم تو ویٹ جانتے ہیں، لہٰذا وقت سے پہلے نکلنے والے کے ویٹ کو ہم دیکھتے ہیں کہ اصل ویٹ کیا تھا؟ اور اب جو وقت سے پہلے نکل رہا ہے تو اس وقت کا ویٹ کیا ہے؟ اور دونوں میں فرق کتنا ہے؟ اس فرق کو نکال کر اس کو کہا جاتا ہے کہ آپ جس مدت کے بعد نکل رہے ہو اس کا ویٹ مثلاً ہزار روپے فی لاکھ ہے اور تجویز شدہ وقت کا ویٹ مثلاً پندرہ سو ہے تو گویا آپ نے فی لاکھ ہر ماہ پانچ سو روپے زیادہ لیے، اس لیے وہ زیادہ کاٹ کر آپ کی جو رقم بچے گی، وہ آپ کو واپس دی جائے گی۔ البتہ علماء کے ذمہ ان بینکوں کے چالاک مالکوں نے یہ کام لگا دیا ہے کہ ہماری اس غلط روش کو اسلامی لباس پہنائیں۔ اس لیے علماء نے اس کو بیع قرار دیا ہے، اگرچہ اس میں نہ تو بیع کی حقیقت ہے اور نہ شرائط، اور نہ ہی بینک والوں کا یہ مقصد ہے۔

بعض علماء کی ''تاویل بیع'' کا رد :

مجوزین علماء کے کہنے کے مطابق اگر اس کو بیع بھی مانا جائے تو اس بیع میں درج ذیل خلافِ شرع امور پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے بھی یہ معاملہ ناجائز اور حرام واکل بالباطل کی ایک صورت ہے :

(١) وقت پورا کرنے سے پہلے نکلنے والے کا حصہ بازاری قیمت سے بہت کم قیمت پر خریدا جاتا ہے، اور علماء کی تائید سے اس بیچارے کلائنٹ کو کم قیمت پر اپنا حصہ فروخت کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، اور ایسی پُرفریب بیع کا ناجائز وظلم ہونا اور اکل

بالباطل کا ذریعہ ہونا، اظہر من الشمس ہے۔

(۲) حصہ کی نسبت کل کاروبار کے تناسب سے معلوم ہونا ضروری ہے اور یہ کاروبار کے ''حجم'' کے معلوم ہونے پر موقوف ہے اور'' کاروبار کا حجم'' کسی کو معلوم نہیں، کیونکہ اس کا حجم سرمایہ کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے۔

(۳) نکلنے والے رب المال کو حصہ بیچنے میں شرعاً تین اختیار حاصل ہیں:

(الف) بینک کو بیچے۔

(ب) کسی قدیم شریک کو بیچے۔

(ج) کسی اجنبی (غیر شریک) کو بیچے۔

جیسا کہ دار العلوم کراچی کے تصدیق شدہ مضاربت نامہ میں عقدِ مضاربت ختم کرنے کی صورتوں میں تحریر ہے :

''فریقِ اول اپنے متناسب اثاثے باہمی رضامندی سے کسی تیسرے فریق کو بیچ دے۔اس صورت میں وہ شخص فریقِ اول کی جگہ رب المال کی حیثیت میں آجائے گا اور اس کے ساتھ معاملے کی وہی شرائط وتفصیلات ہوں گی جو اس وقت فریقِ اول مذکور کے ساتھ ہیں''۔

(فتویٰ نمبر ۵۴/۱۳۲۷، از دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی)

جبکہ بینک اس کے اس شرعی اختیار کو سلب کر کے بینک ہی کو فروخت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

(۴) بیع میں تراضی شرط ہے اور یہ علمِ بیع پر موقوف ہے جبکہ اکثریت کو یہ علم ہی نہیں کہ یہ بیع ہو رہی ہے بلکہ خود بینک کے اس شعبے سے متعلق افسران کو بھی معلوم نہیں کہ یہ بیع ہے۔

قال العلامة الزيلعي رحمه الله تعالىٰ : هُوَ مُبَادَلَةُ المَالِ بِالمَالِ

۳ ۸

بِالتَّرَاضِي وَهَذَا فِي الشَّرعِ وَفِي اللُّغَةِ هُوَ مُطلَقُ المُبَادَلَةِ مِن غَيرِ تَقيِيدٍ بِالتَّرَاضِي وَكَونُهُ مُقَيَّدًا بِهِ ثَبَتَ شَرعًا لِقَولِهِ تَعَالَى ﴿إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ﴾ .(تبيين الحقائق ۴ / ۲، ط:امداديه)

(۵) تراضی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بائع اور مشتری دونوں کو ثمن معلوم ہو کہ اس وقت مارکیٹ ویلیو کے حساب سے اس حصے کی قیمت اور ثمن اتنا ہے جبکہ بائع اور مشتری دونوں کو اس کا علم نہیں ہوتا کیونکہ اس علم کے لیے کئی مارکیٹوں کا چکر لگانا ناگزیر ہے جس کا تحمل بینک نہیں کر سکتا اور کمپیوٹر میں ایسا پرزہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا جس کے دبانے سے مختلف اثاثوں کی مختلف کنڈیشنز کے مطابق فی الحال موجودہ مارکیٹ ویلیو یکدم اسکرین پر نمایاں ہو جائے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ تحت قوله : (قَولُهُ إن قَبلَ القَبضِ لَم يَصِحَّ) ......قُلت : وَمِثلُهُ قَولُهُ فِي الذَّخِيرَةِ : اشتَرَى شَيئًا ثُمَّ أَشرَكَ آخَرَ فِيهِ فَهَذَا بَيعُ النِّصفِ بِنِصفِ الثَّمَنِ الَّذِي اشتَرَاهُ بِهِ .ا هـ. وَمُقتَضَاهُ أَنَّهُ يَثبُتُ فِيهِ بَقِيَّةُ أَحكَامِ البَيعِ مِن ثُبُوتِ خِيَارِ العَيبِ وَالرُّؤيَةِ وَنَحوِهِ وَأَنَّهُ لَا بُدَّ مِن عِلمِ المُشتَرِي بِالثَّمَنِ فِي المَجلِسِ.(الشامية ۶ / ۵۰۲ ط رشيدية)

(۶) اس کے حصے کا ایک جزء مرابحاتِ مؤجلہ (ادھار کاروبار) کی وجہ سے دوسروں کے ذمے دَین اور ادھار ہوتا ہے اور دین کی بیع ''مَن علیه الدين '' سے تو جائز ہے لیکن ''مَن غیر مَن علیه الدين'' سے جائز نہیں اور بینک ''مَن غیر مَن علیه الدين'' میں سے ہے۔ لہٰذا یہ جزء اس پر بیچنا بھی جائز نہ ہوگا۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یہ معاملہ دو وجہ سے ناجائز اور حرام ہے۔ایک یہ کہ یہ بیع الدین من غیر

من علیہ الدین ہے، جو نا جائز ہے...... (احسن الفتاویٰ ۷/۱۷۶)

(۷) اس کے حصے کا ایک جزء نقد کرنسی بھی ہے ،جس کی بیع ''بیع الفلس بالفلس'' ہے اور اس میں بالاتفاق ''نسیئہ'' حرام ہے، کیونکہ ملکی کرنسی بالاتفاق جنسِ واحد ہے اور جنس تنہا ''حرمتِ نسیئہ'' کے لیے کافی ہے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله تعالىٰ : وَبِخِلَافِ مَا اِذَا كَانَ اَحَدُهُمَا بِغَيْرِ عَيْنِهٖ لِاَنَّ الْجِنْسَ بِانْفِرَادِهٖ يُحَرِّمُ النَّسَآءَ.

(الهداية ۳/۸۶،ط:رحمانيه)

''نسیئہ'' کی صورت یہ ہے کہ اکاؤنٹ ہولڈر بینک کے ذریعے خرید و فروخت اور ادائیگیاں کرتا ہے، اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ اس نے بینک سے عقد کب کیا؟ چیک لکھنے کے وقت یا کسی کو چیک دیتے وقت یا لینے والے کا اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرتے وقت یا ایک بینک کا دوسرے بینک کو اطلاع دیتے وقت یا دوسرے بینک کو رقم بھیجتے وقت۔ غرض یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی صورت ہو، نسیئہ سے خالی نہیں۔

مندرجہ بالا ناجائز وجوہ اور ان جیسی دوسری کئی ناجائز وجوہ کی بنا پر ملک کے کئی نامور، جید اور مقتدر مفتیانِ کرام نے اسلامی نامی بینکوں کے نظام کو خلافِ شرع قرار دے کر اس کو مسترد کرتے ہوئے اس کو ناجائز فرمایا ہے۔

الحاصل : عدمِ جواز کی مندرجہ بالا وجوہ اور اکابر مفتیانِ کرام کے عدمِ جواز کے فتاویٰ کے بعد بینکوں کا غیر مدلل فتاویٰ شائع کرنا اور اس کے ذریعے عوام الناس کو اس حرام میں مبتلا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں، جو اس طرح کرے گا وہ بھی گناہ میں شریک ہوگا۔

۷۰

مقتدر مفتیانِ کرام کا مروجہ اسلامی بینکوں اور ٹی وی چینل پر تبلیغ سے متعلق فیصلہ :

ملک کے مختلف اطراف کے اہلِ فتویٰ علمائے کرام کا مروجہ اسلامی بینکوں اور ٹی وی چینل سے متعلق ایک اجلاس 25 شعبان المعظم 1429ھ بمطابق 28 اگست 2008ء بروزِ جمعرات حضرت حضرت شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کی زیرِ صدارت جامعہ فاروقیہ کراچی میں منعقد ہوا۔

اس اجلاس میں شریک مفتیانِ عظام نے متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا کہ اسلام کی طرف منسوب مروجہ بینکاری قطعی غیر شرعی اور غیر اسلامی ہے ،لہٰذا ان بینکوں کے ساتھ اسلامی یا شرعی سمجھ کر جو معاملات کیے جاتے ہیں وہ ناجائز اور حرام ہیں اور ان کا حکم دیگر سودی بینکوں کی طرح ہے۔

ان میں سے چند مشہور و معروف مفتیان کرام کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا مفتی حمید اللہ جان صاحب...... جامعۃ الحمید لاہور
(۲) حضرت مولانا مفتی زرولی خان صاحب...... احسن العلوم کراچی
(۳) حضرت مولانا مفتی عبد المجید دین پوری شہید صاحب...... جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی
(۴) حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ شیخ صاحب...... نورانی مسجد صرافہ بازار کراچی
(۵) حضرت مولانا مفتی عبد اللہ صاحب...... خیر المدارس، ملتان
(۶) حضرت مولانا مفتی گل حسن صاحب...... دار العلوم رحیمیہ نیلا گنبد سرکی روڈ کوئٹہ
(۷) حضرت مولانا مفتی روزی خان صاحب...... دار الافتاء ربانیہ جی، او، آر کالونی کوئٹہ
(۸) حضرت مولانا مفتی انعام الحق صاحب...... جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی
(۹) حضرت مولانا مفتی سمیع اللہ صاحب...... جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی کراچی
(۱۰) حضرت مولانا مفتی عبد الغفار صاحب...... جامعہ اشرفیہ والس روڈ سکھر

فیصلے کی تحریری روئیداد بعینہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گزشتہ چند سالوں سے اسلامی شرعی اصطلاحات کے حوالے سے رائج ہونے والی بینکاری کے معاملات کا قرآن وسنت کی روشنی میں ایک عرصے سے جائزہ لیا جا رہا تھا اور ان بینکوں کے کاغذات، فارم اور اصولوں پر غور وخوض کے ساتھ ساتھ اکابرین فقہاء کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا جاتا رہا تھا۔ بالآخر اس سلسلے میں حتمی فیصلے کے لیے ملک کے چاروں صوبوں کے اہل فتویٰ علمائے کرام کا ایک اجلاس مورخہ 28 اگست 2008ء مطابق 25 شعبان المعظم 1429ھ بروز جمعرات حضرت شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کی زیر صدارت جامعہ فاروقیہ کراچی میں منعقد ہوا۔

اجلاس میں شریک مفتیان عظام نے متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا کہ اسلام کی طرف منسوب مروجہ بینکاری قطعی غیر شرعی اور غیر اسلامی ہے۔ لہٰذا ان بینکوں کے ساتھ اسلامی یا شرعی سمجھ کر جو معاملات کیے جاتے ہیں وہ ناجائز اور حرام ہیں اور ان کا حکم دیگر سودی بینکوں کی طرح ہے۔

اس اجلاس کے شرکاء نے اس بات پر بھی اتفاق کا اظہار کیا کہ جدیدیت کی رو میں بہہ کر تصویر کی حرمت کا حکم نہیں بدلا جا سکتا ہے۔ جان دار کی تصویر کی جتنی اور جو شکلیں اب تک متعارف ہوئی ہیں، عرف وعادت، لغت اور شرعی نصوص کی رو سے وہ سب تصویر کے حکم میں ہیں۔ آلات صنعت وحرفت کے بدلنے سے تصویر کے شرعی احکام نہیں بدلتے۔ اس لیے جو حکم شریعت میں تصویر کا منقول ہے تصویر کی تمام شکلیں اس حکم کے تحت داخل ہیں۔ اس لیے تصویر کی اباحت اور جواز کا راستہ اختیار کرتے ہوئے کسی قسم کے ٹی وی چینل کا اجراء یا علماء کرام کا ٹی وی پر آنا اور اسے تبلیغ دین کی ضرورت کہنا اور سمجھنا شریعت کی خلاف ورزی ہے اور جدیدیت واباحیت کی ناجائز پیروی ہے۔

مسلمانوں پر واجب اور لازم ہے کہ دیگر حرام اور خلاف شرع امور کی طرح ان سے بھی بچنے کا بھرپور اہتمام فرمائیں۔

(۸) حضرت مولانا مفتی انعام الحق صاحب

متبادل حاضر ہے

خلاف شرع شرکت سے بچنے کا شرعی متبادل :

(۱) بینک کی عمومی جو دیون کی مدت ہوتی ہے اس کے مطابق ہر سال کا جدا کھاتہ بنایا جائے مثلاً اگر بینک کے دیون کی زیادہ سے زیادہ مدت چھ سال ہے تو چھ کھاتے بنائے جائیں۔ پہلے سال کی رقوم کے لیے ہفتہ یا پندرہ دن رقم جمع کرنے کے لیے مقرر کیے جائیں، جتنی رقوم ان دنوں میں جمع ہو جائیں بینک اس سال انہی رقوم سے پورا سال کاروبار کرے اور دوسرے لوگ جو رقوم سال کے دوران لا رہے ہوں ان کو بطور قرض کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع کرے اور اس کو مشترک کاروبار میں نہ لگائے، سال کے اختتام پر یہ کھاتہ بند کر کے دوسرا کھاتہ کھولا جائے اور اس کے لیے بھی ہفتہ دو ہفتہ جو مدت مناسب ہو مقرر کی جائے اور سال کے دوران کرنٹ اکاؤنٹ کی جمع شدہ رقم بھی اس کھاتے میں منتقل کر دی جائے اور نئے لوگ جو شرکت کرنا چاہیں وہ بھی رقوم جمع کرائیں مقررہ تاریخ تک جتنی رقوم جمع ہو جائیں اس سال انہی رقوم سے پورا سال کاروبار کریں اور سال کے دوران جو رقوم آتی ہیں انہیں کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع کرتے رہیں اسی طرح تیسرے سال یہ کھاتہ بند کر کے تیسرا کھاتہ کھولا جائے اور اس کے لیے بھی ہفتہ دو ہفتہ جو مدت مناسب ہو مقرر کی جائے اور سال کے دوران کرنٹ اکاؤنٹ کی جمع شدہ رقم بھی اس کھاتے میں منتقل کر دی جائے اور نئے لوگ جو شرکت کرنا چاہیں وہ بھی

رقوم جمع کرائیں، مقررہ تاریخ تک جتنی رقوم جمع ہو جائیں اس پورے سال انہی رقوم سے کاروبار کریں، اور سال کے دوران جو رقوم آتی ہیں انہیں کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع کرتے رہیں۔ غرض یہ کہ چوتھے، پانچویں اور چھٹے سال بھی یہی معاملہ کیا جائے۔

(۲) رب المال سے چھ سال کے مضاربہ کے لیے پیسے لیے جائیں، چھ سال سے پہلے وہ اپنا حصہ کسی پر نہیں بیچ سکے گا، نہ بینک کو، نہ کسی اور شخص کو کیوں کہ اس کے حصے میں دیون بھی شامل ہو چکے ہیں اور اب اگر اپنا حصہ کسی کو بیچے گا تو یہ ''تملیک الدین ممن لیس علیه الدین'' کے قبیل سے ہوگا جو کہ جائز نہیں ہے۔

چھ سال کے بعد اس کو اختیار ہوگا کہ مزید چھ سال کے لیے شرکت و مضاربت کرے یا اپنا حصہ بینک کو یا کسی اور کو جو اس کھاتے میں شریک ہو یا کسی ثالث اور اجنبی کو بیچ دے البتہ اس بیچنے میں درج ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

(الف) حصے کا ثمن (قیمت) حصے کے نقد سے زیادہ ہو مثلاً اگر اس کے حصے میں نقد روپے دس لاکھ ہیں اور باقی اثاثے ہیں تو بوقتِ بیع اس کے حصے کا ثمن دس لاکھ سے زیادہ ہو۔

(ب) چونکہ مقدارِ نقد تک یہ بیع صرف ہے جس میں مجلسِ عقد میں عوضین پر قبضہ ضروری ہے۔

یہ اس صورت میں ہے جب نوٹ کو سونا چاندی کی رسید تسلیم کیا جائے اور یہ نوٹ اپنی پشت پر موجود سونے چاندی کی نمائندگی کر رہا ہو، جیسا کہ ''فتاوی بینات'' میں اس

کی تصریح ہے:

''سونے کی خرید و فروخت کے لیے لازم ہے کہ معاملہ دونوں طرف سے نقد اور ہاتھ در ہاتھ ہو، ادھار والی صورت میں چونکہ سود لازم آتا ہے اس لیے یہ صورت شرعاً ناجائز ہے۔'' (فتاوی بینات،۴/۱۲۰، ط: مکتبہ بینات جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن)

یا یہ ''بیع الکالی بالکالی'' ہے بشرطیکہ نوٹ کو سونا چاندی کے سوا دوسری اشیاء کی رسید مانا جائے جیسا کہ حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالی کی رائے ہے تو اس قول کی بناء پر بھی مجلسِ عقد میں عوضین پر قبضہ ضروری ہوگا۔

جبکہ یہاں یہ ممکن نہیں لہٰذا اس کی صورت یہاں یہ اختیار کی جائے کہ مقدارِ نقد مشتری اس بائع کو قرض دے اور وہ یہ قرض بینک کے حوالے کرے کہ بینک میرا یہ قرض آپ کو حوالے کر دے گا اور پھر اس کی مرضی ہے کہ قرض بینک سے وصول کرے یا بینک میں کاروبار کے لیے چھوڑ دے۔ حضرت حکیم الامۃ قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

''اب بعض چیزیں اس کے متعلق قابلِ تحقیق رہ گئیں ان کو بھی عرض کرتا ہوں، ایک یہ کہ بعض شریک حصہ دار اپنا حصہ دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس میں بدلین کا یداً بید تقابض نہیں ہوتا صرف حساب میں بائع کا نام خارج ہو جاتا ہے دوسرے بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات بدلین کی مقدار برابر ہی نہیں ہوتی مثلاً کسی کا حصہ سو روپے کا ہے وہ ایک سو دس میں فروخت کرتا ہے سو یہاں تماثل و تساوی بھی نہیں سو دوسرے محظور کا تو جواب ظاہر ہے اس لیے کہ بائع دو چیزوں کا مالک ہے

۳۷۵

ایک تو کھمبوں اور تاروں کا اور عمارت وغیرہ سامان کا دوسرے کچھ روپے کا جو وہاں داخل ہے سو وہ ایک سو دس روپے کے عوض میں نہیں ہے بلکہ کچھ سامان کے عوض میں ہے کچھ روپے کے عوض میں ہے اور جس روپے کے عوض میں ہے وہ غالبًا وعادۃً اس کی مقدار ایک سو دس کی نہیں اگر ایک روپیہ بھی کم ہو تو دوسرا محظور لازم نہیں مثلاً وہاں اگر اس بائع کا ایک سو نو روپے ہو تو مشتری کے ایک سو دس روپے میں سے ایک سو نو تو اس ایک سو نو روپے کے مقابلے میں ہو گیا اور ایک روپیہ دوسرے سامان کے عوض میں ہو گیا رہا قصہ تقابض کا سو اس کا ایک حیلہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ مشتری بائع سے یوں کہے کہ تمہارا جتنا روپیہ کمپنی میں ہے میں اپنے اس زرِ ثمن میں سے اس قدر دیتا ہوں اور تم اس قرض کا حوالہ اس کمپنی پر کر دو کہ میں اس سے وصول کروں یا کسی کام میں لگا دوں اور جو زرِ ثمن میں اس روپے سے کچھ زیادت ہے اس کے عوض تمہارے حصے کا سامان از قبیلِ عروض خریدتا ہوں اسی حیلے سے وہ محظور بھی دفع ہو گیا البتہ اس پر ایک سوال ہوگا کہ اس ایک روپے کی مقدار تو معلوم نہیں جس کے عوض یہ قرض دیتا ہے تو مجہول کا قرض کیسا؟ اس کا حل منقول تو دیکھا نہیں لیکن قواعد و نظائر میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جہالت مضر نہیں بلکہ صرف وہ جو مفضی الی النزاع ہو اور یہاں یہ احتمال نہیں لہٰذا گنجائش ہو سکتی ہے۔ (امداد الفتاویٰ ۳/۴۹۲)

اور اگر نوٹ کو ثمنِ عرفی تسلیم کیا جائے جیسا کہ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہم کی رائے ہے تو اس صورت میں مجلسِ عقد میں احد البدلین پر قبضہ ضروری ہوگا تاکہ ''بیع الکالی بالکالی'' کی خرابی لازم نہ آئے۔

۷۶

(۴) چھ سال کے بعد بینک کو بھی اختیار ہے کہ اس کھاتے میں نئے آنے والوں کو بھی شریک کرے، البتہ یہ جواز اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس کھاتے کے قدیم شرکاء کے حصے کے جو اثاثے ہیں ان کی قیمت لگا کر نفع کی صورت میں قدیم شرکاء کا حصہ بڑھا کر اور نقصان کی صورت میں گھٹا کر اس تناسب سے نئے آنے والوں کو شریک کر دیا جائے۔

(۵) یہ بھی ضروری ہے کہ ہر سال کرنٹ اکاؤنٹ میں جو قرضے جمع ہوتے ہیں ان قرضوں کے کاروبار اور نفع نقصان کا حساب دوسرے شرکاء اور ارباب الاموال سے علیحدہ رکھا جائے کیونکہ اس قرض اور اس کے نفع و نقصان کا تعلق صرف مضارب (بینک) سے ہے۔

(۶) ہر سال کے کھاتے میں جمع شدہ رقم کی مقدار سے زیادہ کاروبار کرنا ارباب الاموال کی صریح اجازت کے بغیر جائز نہیں اگر ان کی اجازت کے بغیر بینک نے کر لیا تو اس کے نفع و نقصان کا تعلق صرف مضارب (بینک) سے ہوگا، البتہ اگر سب شرکاء نے صریح اجازت دے دی تو جس حد تک اجازت دی گئی ہے اس حد تک سرمائے کی مقدار سے زائد کاروبار کیا جا سکتا ہے، اور اس صورت میں اس زائد کاروبار کے نفع و نقصان کی تقسیم ضمان کے تناسب سے ہوگی، پہلے سے شرکت عنان میں جو تناسب مقرر ہے اس تناسب سے نہ ہوگی۔ لہٰذا اگر فریقین (مضارب، رب المال) نے صراحۃً ضمان کا تناسب طے کیا مثلاً ۶۰ اور ۴۰ فیصد یا ۷۰ اور ۳۰ فیصد یا ۸۰ اور ۲۰ فیصد تو اس طے شدہ نسبتِ ضمان کے مطابق نفع اور نقصان تقسیم ہوگا ورنہ نصف نصف کا ہر ایک ضامن ہوگا اور نفع و نقصان بھی اسی تناسب سے ہوگا۔

۷۷

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ''استدانہ''یعنی سرمائے کی مقدار سے زائد کاروبار کی جتنی صورتیں ہیں، ہر صورت میں اس کے نفع ونقصان کا اصول جدا ہے، لہٰذا مضارب (بینک) پر لازم ہے کہ اس کے حسابات اصل سرمائے کے حسابات سے جدا رکھے۔ ہاں اگر ضمان کی کسی ایسی صورت کا تعین ممکن ہو جس کا نفع اور نقصان اصل سرمائے کے نفع ونقصان کے تناسب کے برابر ہو تو اس صورت میں پھر تقسیمِ نفع کے لیے علیحدہ حسابات رکھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن نقصان کی خاطر اس صورت میں بھی علیحدہ حسابات رکھنا ضروری ہوں گے کیونکہ ''استدانہ''میں دونوں پر بقدرِ ضمان نقصان آتا ہے۔ لیکن یہ صورت کثیر ارباب الاموال کی صورت میں بظاہر ناممکن معلوم ہوتی ہے۔

(۷) مضارب، ارباب الاموال میں سے کسی کو ملازمت پر نہ رکھے۔

(۸) بینک کے مالکان جو اپنے آپ کو شرکاء سمجھتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ کام کرنے والا شریک یا دوسروں سے زیادہ کام کرنے والا اپنے کام کی متعین اجرت نہ لے بلکہ ان کے لیے نفع کے تناسب میں شرحِ نفع زیادہ مقرر کی جائے۔

(۹) رہی یہ بات کہ بینک حقیقت میں کاروبار بھی کرتا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں بینک کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ ہر خریداری اور فروختگی کی مکمل دستاویزات محفوظ رکھے اور بوقتِ طلب اس کی فوٹو کاپی رب المال کے حوالے کردے۔

(۱۰) بنامِ نفع ماہانہ جو رقم ہر کلائنٹ اور رب المال کو دی جاتی ہے اس کو سرمائے کے خاص تناسب سے طے کیا جائے مثلاً ایک لاکھ سرمائے پر ہزار روپے رب المال اور ہزار روپے مضارب لے سکتا ہے اور حتمی حساب چھ سال کے بعد کرکے کمی زیادتی برابر کرلی جائے۔

۷۸

شرکت ختم کرنے کی خرابی کا شرعی متبادل :

شرکت ختم کرنے کی خرابی کا شرعی متبادل یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں شرکت و مضاربت ختم کرنے کی جو صورتیں بتائی ہیں، ان کے مطابق عمل کیا جائے اور وہ صورتیں چار ہیں :

(۱) باہمی رضامندی سے رب المال اپنا حصہ مضارب کو بیچے۔

(۲) کسی دوسرے شریک (اکاؤنٹ ہولڈر) کو بیچے۔

(۳) کسی غیر شریک (باہر کے کسی شخص) کو بیچے اور اس صورت میں وہ خارجی شخص اِس کی جگہ پر آجائے گا اور وہی معاملات اِس جدید آدمی کے ساتھ بھی ہوں گے۔

(۴) اس وقت جتنا مال موجود ہے وہ سب بک کر نقد میں تبدیل ہو جائے پھر اس میں سے جو راُس المال ہوگا وہ رب المال کو اور منافع طے شدہ نسبت کے حساب سے تقسیم کر دیے جائیں۔

مؤخر الذکر صورت نمبر۴ پر آج کل عمل مشکل ہے، خصوصاً جبکہ کاروبار پھیلا ہوا ہو، اس لیے عام طور پر آج کل پہلی ۳ صورتیں ہی بتائی جاتی ہیں۔

واضح رہے کہ ''جامعہ دار العلوم کراچی'' سے شائع شدہ مضاربت نامے میں شریک کو یہ تینوں اختیارات دینے کا تذکرہ ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

''۱۱۔ اس عقد کی شق نمبر۲ اور ۳ میں ذکر کردہ تفصیل کے تحت یہ عقدِ مضاربت ختم ہونے کی صورت میں فریق اول کے اثاثوں کا تصفیہ درج ذیل طریقوں سے ہو سکے گا۔

(الف) فریق اول اپنے متناسب اثاثے باہمی رضامندی سے فریق

ثانی کو بیچ دے۔

(ب) فریق اول اپنے متناسب اثاثے باہمی رضامندی سے دوسرے شرکاء (فریق اول کے دیگر ارباب الاموال) میں سے کسی کو بیچ دے۔

(ج) فریق اول اپنے متناسب اثاثے باہمی رضامندی سے کسی تیسرے فریق کو بیچ دے، اس صورت میں وہ شخص فریق اول کی جگہ رب المال کی حیثیت میں آجائے گا۔

اور اس کے ساتھ معاملہ کی وہی شرائط وتفصیلات ہونگی جو اس وقت فریق اول مذکور کے ساتھ ہیں۔'' (فتوی نمبر ۱۳۲۷/۵۴:۳/۲/۳۲ھ)

جبکہ بینک کا اصرار یہ ہے کہ شرکت ختم کرنے والا شخص اپنا حصہ بینک کو ہی بیچے اور بینک کا یہ اصرار اور اسی ایک صورت کے تعین کا راز ماقبل میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

محدود ذمہ داری سے بچنے کا شرعی متبادل:

(۱) بینک اپنے سرمائے کی حد تک کاروبار کرے۔

(۲) اگر زائد از سرمایہ کرنا ہے تو شرکاء کی اجازت کے مطابق کرے اور محدود ذمہ داری کی شرط نہ لگائے، ایسی صورت میں نقصان بقدرِ ضمان ہر ہر شریک پر پڑے گا۔ مضارب (بینک) پر سارا نقصان نہیں آئے گا۔

سیکورٹی ڈپازٹ کا شرعی متبادل: سیکورٹی ڈپازٹ میں اس خرابی کی وجہ سے حضرات مجوزین کو یہ تجویز دی گئی تھی کہ کرائے کی آخری کچھ اقساط شروع میں ہی وصول کر لی جائیں یعنی دس سال کے کرائے میں سے آخری سال کا کرایہ پہلے وصول کرلیا جائے پھر باقی ماہانہ بنیادوں پر اپنی ترتیب سے لیا جاتا رہے، یہ ایڈوانس کا متبادل ہے۔

۸۰

اجارہ میں خلاف شرع وعدہ وغیرہ کی خرابی سے بچنے کا شرعی متبادل: اس کا شرعی متبادل یہ ہے کہ بینک والے اپنا شوروم خود کھول لیں تاکہ یہ وعدہ وغیرہ کی خرابی لازم ہی نہیں آئے۔

صفقة فی صفقة وغیرہ خرابی سے بچنے کا شرعی متبادل: اس صورت کا شرعی متبادل یہ ہے کہ گاڑی مرابحۃً فروخت کردی جائے لیکن اجارہ میں چونکہ بینک کا مفاد وابستہ ہے اس لیے وہ مرابحہ کا معاملہ نہیں کرتا۔

مرابحہ میں خلاف شرع امور سے بچنے کا شرعی متبادل:

(۱) چونکہ بینک کو کئی سالوں کے تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے خریداروں کی ضرورت کی چیزیں کیا کیا ہیں؟ تو وہ اشیاء پہلے سے خرید کر رکھے۔

(۲) بیع مرابحہ ایسے لوگوں سے کرے جن کے بارے میں یہ اطمینان ہو کہ یہ اقساط بروقت ادا کریں گے اور بدون مجبوری تاخیر اور ٹال مٹول نہیں کریں گے۔

(۳) اگر کسی کی طلب پر اسی وقت خریداری کرنی ہو تو نہ ایڈوانس کی شرط لگائی جائے اور نہ ہی وعدہ کی بنیاد پر جبراً خریداری پر مجبور کیا جائے بلکہ اس کو اختیار ہو کہ وعدہ کے مطابق خریدے یا چھوڑے نیز مبیع میں نقصان آنے یا بازاری قیمتیں گرنے کی وجہ سے اس پر نقصان کا ضمان نہ ڈالا جائے اور خریداری کے بعد عیب وغیرہ سے رد کا اختیار دیا جائے یا بشرط براءة من جمیع العیوب بیع کی جائے نیز شرعی اصولوں کے مطابق بیع سے قبل وکالۃ کا قبضہ جو قبضۂ امانۃ ہے، کو ختم کروا کر اس قبضہ کو قبضۂ ضمان بنادیا جائے پھر بیع کی جائے۔ تکافل کے اخراجات بھی اصل رقم میں شامل نہ کیے جائیں البتہ ربح اور نفع میں اس کی نسبت سے اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

بینک کے منجمد اثاثے مشترک ہیں؟؟؟

اشـــکــال : بینک سے وابستہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ منجمد اثاثے مثلاً بینک کی ذاتی عمارتیں، جائداد اور فرنیچر وغیرہ صرف بینک کی ملکیت ہوتی ہیں ان میں شرکاء اور اکاؤنٹ ہولڈرز کی شرکت نہیں ہوتی۔

جواب : بینک کے ترجمان علماء نے خود اس بات کو رد کیا ہے، جامعۃ الرشید سے شائع ہونے والی کتاب میں نکلنے والے شریک پر بینک ہی کو اپنا حصہ بیچنے کے لزوم کے لئے سب سے بڑی دلیل کے طور پر یہ بات پیش کی گئی ہے کہ اگر بینک کو نہیں بیچے گا تو بینک کے تمام منجمد اثاثوں مثلاً کرسی میز وغیرہ کی شرکاء کی نسبت سے ہزاروں حصے اور ٹکڑے کرنے پڑیں گے جس میں شرکاء کا نقصان ظاہر ہے کہ اب یہ ٹکڑے اونے پونے داموں بکیں گے۔ ان کی اس دلیل سے معلوم ہوا کہ تمام شرکاء بینک کے تمام منجمد اثاثوں میں شریک ہیں۔

تسکینِ خاطر کے لئے جامعۃ الرشید کی کتاب ''غیر سودی بینکاری'' سے مکمل تحریر مع مختصر تبصرہ پیش خدمت ہے۔

> ''بعض حضرات کی طرف سے اسلامی بینکوں میں رائج اس شرط کو شرطِ فاسد میں شمار کر کے بینکوں کے معاملات کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اور وہ شرط یہ کہ شرکت ختم کرنے والے کو اس کی مملوکہ اثاثوں میں سے حصہ دینے کے بجائے اسے اپنا مشاع حصہ بیچنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ **(اقول: یہ اعتراض کسی نے نہیں کیا، بلکہ اشکال تو یہ ہے کہ نکلنے والے شریک کو اپنا حصہ بینک ہی کو بیچنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے؟ احمد ممتاز)** اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ مملوکہ حصوں کے بیچنے پر جبر والی شرط کو شرطِ فاسد تسلیم کر بھی لیا جائے تو آگے تفصیلاً آ رہا ہے کہ شرکت شروطِ فاسدہ سے فاسد نہیں ہوتی لہٰذا یہ شرط ہی لغو ہوگی یعنی شریک شرکت ختم کر کے علیحدہ ہونا چاہے گا تو اسے خیار

حاصل ہوگا کہ چاہے تو اپنا مشاع حصہ بیچے چاہے نہ بیچے۔ لیکن اگر وہ اپنی سہولت کیش رقم کی وصولی میں ہی سمجھے اور اثاثے بینک کو فروخت کرنا اپنے لیے اہون سمجھے اور بینک بھی اس پر راضی ہو تو اسے کوئی بھی عین اثاثوں میں سے اپنا حصہ لینے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

اور اگر غور کیا جائے تو ارباب الاموال کے لیے سہولت بھی اسی میں ہے، ورنہ ارباب المال اس مشاع کے عین سے تو بہر حال انتفاع نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں ہزاروں لوگ شریک ہیں نیز اثاثوں کے مشاع حصے کو عام مارکیٹ میں فروخت کرنا اس کے لیے عادۃً ناممکن ہے، لہٰذا اسے یہ حصہ ایسے شخص کے ہاتھوں ہی فروخت کرنا پڑے گا جو ان اثاثوں میں دیگر شرکاء کے ساتھ شریک ہو کر اس کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہو۔ **اور انہیں بھی اگر زائد قیمت پر فروخت کرے گا یہ خریدیں گے ہی نہیں** کیونکہ ان نئے شرکاء کے لیے کاروبار میں شرکت کی غرض سے ان اثاثوں کی بقدر مشاع حصہ میں شرکت اس زائد قیمت سے کم میں بھی ممکن ہے، کیونکہ بینک کی طرف سے تو ہر ایک کو اجازت ہے کہ جو چاہے جب چاہے اکاؤنٹ کھولکر ان اثاثوں میں اپنے سرمایہ کے تناسب سے شریک ہو جائے۔

اور ان کے سوا کسی دوسرے شخص کو ان اثاثوں میں قطعاً رغبت نہ ہوگی۔ لہٰذا شرکت ختم کرنے والا شخص اپنے مشاع حصے تو بہر حال ایسے شخص کے ہاتھوں ہی فروخت کر سکے گا جو اس کاروبار کا حصہ دار بننا چاہتا ہو کیونکہ عملی طور پر سہولت کا راستہ اسی میں متعین ہے اور اس کام کے لیے سب سے آسان راستہ اس کے لیے بینک ہی ہے کہ براہ راست بینک کو فروخت کر

دے کیونکہ بینک ہی بآسانی یہ حصہ خرید کر اپنے پاس یا آگے اس کاروبار میں شریک ہونے والے کسی دوسرے شخص کو فروخت کر سکتا ہے۔

لہٰذا شرکت ختم کرتے وقت اپنا مشاع حصہ بیچنے کی شرط کو اگر شرط فاسد مان بھی لیا جائے تو اولاً تو شرکت/مضاربت کے عقد پر اس شرط سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ شرکت/مضاربت ایسی شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوگی، ثانیاً اس شرط کو لغو مان کر شرکت ختم کرنے والے شریک کو اثاثے بیچنے اور نہ بیچنے دونوں کا اختیار دینے کے نتیجے میں بھی عملی طور پر ہوگا بہر حال وہی جو اس شرط کو معتبر ماننے کے نتیجے میں ہوتا، یعنی شرکت ختم کرنے والے شخص کے لیے ان اثاثوں سے انتفاع کا عملی طور پر بسہولت یہی راستہ متعین رہ جائے گا کہ **اسے بینک کی مقرر کردہ قیمت پر بینک کے ہاتھوں فروخت کردے**۔ لہٰذا اس شرط کو بہت زیادہ اہمیت دے کر اس کی بنیاد پر بینکوں کے معاملات کو ناجائز اور حرام کہنا **بصیرتِ فقہیہ** کے قطعاً منافی ہے۔

مزید یہ کہ تنضیض کی صورت میں دیگر ارباب الاموال کی طرح خود اس رب المال کا بھی نقصان ہے جو عقدِ شرکت ختم کرنا چاہتا ہے کیونکہ تنضیض کے بعد یہ اثاثے مارکیٹ میں اونے پونے دام نیلام ہوں گے، جبکہ نیلامی کے مصارف اور اس پر اوقات کے ایک کثیر حصے کا صرف ہونا اور پھر نیلامی کے انتظامات کی محنت جیسے امور الگ رہے جبکہ شریک سے بینک جب حصہ خریدتا ہے تو

۱۔ مارکیٹ ویلیو (جو کہ عملاً Book Value ہوتا ہے) پر خریدتا ہے۔

۲۔ بینک اس وقت تک کا نفع بھی رب المال کو اس کی قیمت

میں شامل کر کے دیتا ہے اس صورت میں علیحدہ ہونے والے شریک کی طرف سے تنضیض کا مطالبہ اضرار لنفسہ ولغیرہ من الشرکاء کے سواء کچھ نہیں۔ فقہاء نے بعض ایسی صورت میں تقسیم کے مطالبہ کو ناجائز قرار دیا ہے جب شریک کا مقصد اضرار لنفسہ ولغیرہ کے سواء کچھ نہ ہو جیسے کسی چیز کی تقسیم کے بعد اگر انتفاع ممکن نہ ہو تو شریک کا ایسے مشترک مال کے عین میں اپنے حصے کو الگ کرنے کا مطالبہ فقہاء کے نزدیک باطل ہے جیسے کسی چھوٹے سے کمرے میں تین آدمی شریک ہوں اور ان میں سے ایک اپنا حصہ الگ کرنا چاہے، جبکہ سب کو معلوم ہے کہ علیحدگی کے اس مطالبے میں دیگر سب شرکاء کا بھی نقصان ہے اور تقسیم کا مطالبہ کرنے والے خود اس شریک کا بھی‘‘۔ (غیر سودی بینکاری جامعۃ الرشید ۱۲۶ تا ۱۲۸)

الحاصل یہ پوری عبارت اور خصوصاً اس میں تنضیض (کرسی، میز، الماری وغیرہ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا) کے الفاظ اس پر واضح دلیلیں ہیں کہ بینک کے تمام منجمد اثاثوں میں بھی سب کلائنٹس اور شرکاء شریک ہیں......اب جو اس کا انکار کرتا ہے کہ منجمد اثاثوں میں اکاؤنٹ ہولڈرز شریک نہیں، تو وہ اپنے معاون علماء کی باتوں کو رد کرتے ہوئے ان کے دلائل کی بوسیدہ عمارت کی بنیادیں خود کھوکھلی کر رہا ہے۔ چونکہ ان حضرات کے پاس حقیقت تو ہے نہیں، ہر ایک کے پاس دفع الوقتی کے لئے جدا جدا بعید از قیاس تصوراتی تاویلیں ہیں، .... خدارا! فریقین جو اصل حقیقت ہے اسی کے بیان پر اکتفاء کریں، اور اگر حقیقت ہے ہی نہیں تو مل بیٹھ کر ایک ہی بات گڑھ لیں تا کہ آپس کے تضادات سے محفوظ رہیں، اور پھر آگے پیش کریں۔

۸۵

کرنٹ اکاؤنٹ پر سہولیات کا حصول سود ہے :

اسلامی نامی بینکوں نے کرنٹ اکاؤنٹ پر بھی سود دینے کی پیش کش نہیں، بلکہ اعلان کر دیا ہے، جبکہ ان کے وجود سے قبل سودی بینکوں کا یہ اکاؤنٹ سود سے پاک ہوتا تھا۔ اسی بنا پر اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس سے متعلق جو فتاوی جاری فرمائے ہیں ان میں صاف لکھا گیا ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں سود کا گناہ تو نہیں البتہ اس میں سودی کاروبار میں معاونت کا گناہ ہے۔ چنانچہ حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

......کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں اگرچہ سود لینے کا گناہ نہیں ہے مگر تعاون علی الاثم کا گناہ اس میں بھی ہے۔

(احسن الفتاوی ۷/۱۴)

اب اسلامی نامی بینک......سود......کو......سہولت......کا نام دے کر اخبارات کے ذریعے سے اس کا اعلان کرا رہے ہیں......بطور نمونہ ''بینک اسلامی'' کا اشتہار ملاحظہ فرمائیں جو روزنامہ جنگ کراچی ۱۳/ شعبان ۱۴۳۰ھ مطابق ۵/ اگست ۲۰۰۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ جس میں کرنٹ اکاؤنٹ پر درج ذیل سہولیات کا اعلان ہے:

(۱) مفت آن لائن بینکنگ کی سہولت

(۲) مفت انٹرنیٹ بینکاری اور ای اسٹیٹمنٹ

(۳) مفت اے ٹی ایم کارڈ/ ڈیبٹ کارڈ

(۴) مفت رقم کی منتقلی، پورے پاکستان میں

(۵) مفت پے آرڈر

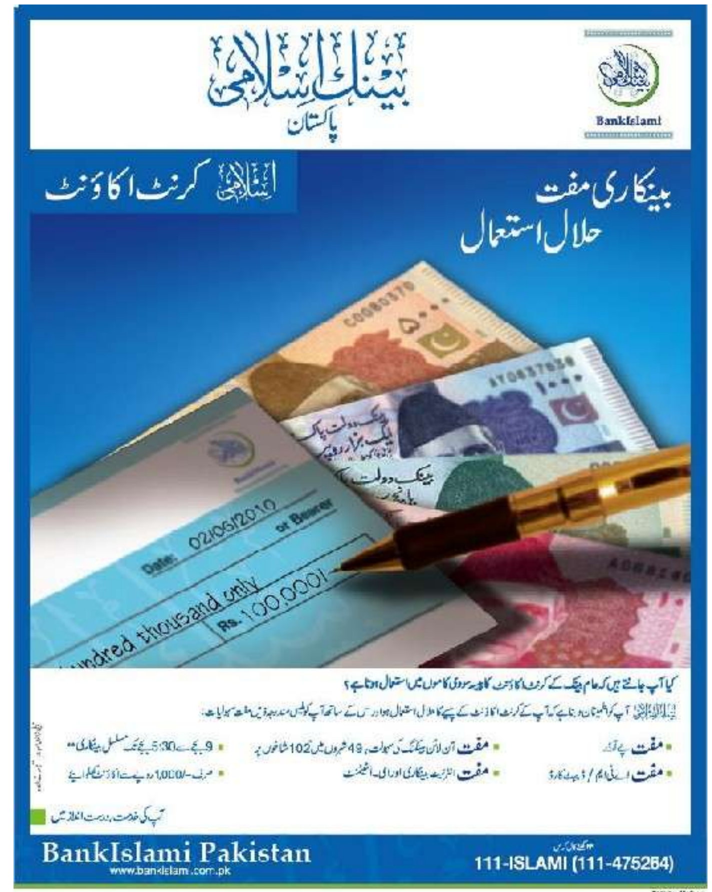
بینک اسلامی
پاکستان
BankIslami
اسلامی کرنٹ اکاؤنٹ
بینکاری مفت
حلال استعمال
کیا آپ جانتے ہیں کہ عام بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ کا پیسہ سودی کاموں میں استعمال ہوتا ہے؟
مفت پے آرڈر
مفت اے ٹی ایم / ڈیبٹ کارڈ
مفت آن لائن بینکنگ کی سہولت، 49 شہروں میں 102 شاخوں پر
مفت انٹرنیٹ بینکاری اور ای اسٹیٹمنٹ
9 بجے سے 5:30 بجے تک مسلسل بینکاری
صرف -/1,000 روپے سے اکاؤنٹ کھلوایئے
آپ کی خدمت، درست انداز میں
BankIslami Pakistan
www.bankislami.com.pk
111-ISLAMI (111-475264)